ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
دسمبر ۱۹۹۴ء

Hilal
LOVE CANDY
The Candy Full Of Love
Lychee
Grapes
Sharifa
Cheeko
Kiwi
Hilal Confectionery (Pvt.) Ltd.
Head Office: 510-Clifton Centre, Kehkashan, Clifton, Karachi.

image

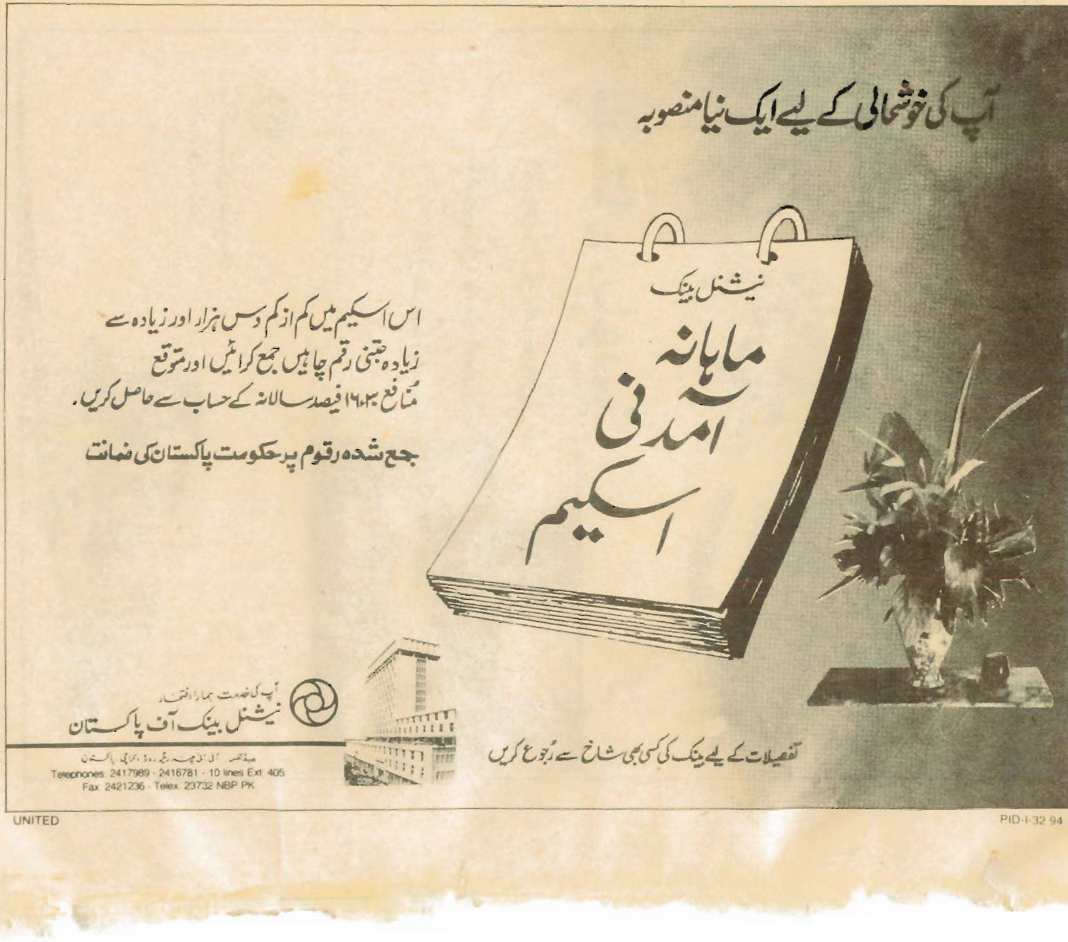
آپ کی خوشحالی کے لیے ایک نیا منصوبہ
نیشنل بینک
ماہانہ آمدنی اسکیم
اس اسکیم میں کم از کم دس ہزار اور زیادہ سے زیادہ جتنی رقم چاہیں جمع کرائیں اور متوقع منافع بہ ۱۶٫۲۰ فیصد سالانہ کے حساب سے حاصل کریں۔
جمع شدہ رقوم پر حکومت پاکستان کی ضمانت
تفصیلات کے لیے بینک کی کسی بھی شاخ سے رجوع کریں
آپ کی خدمت ہمارا افتخار
نیشنل بینک آف پاکستان
Telephones 2417989 - 2416781 - 10 lines Ext 405
Fax 2421236 - Telex 23732 NBP PK
UNITED
PID-I-32 94

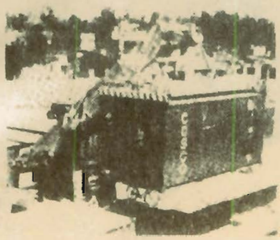

پاکستان ریلویز
ہماری منزل
آپ کی خدمت
اور حفاظت

مسافر ہوں، مال اسباب ہو یا کنٹینرز ہوں
پاکستان ریلویز مکمل ترین اور سب سے زیادہ قابل اعتماد سفری سہولتیں
فراہم کرنے والی قومی سروس ہے

پاکستان ریلوے
حفاظت کی علامت

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۶ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ جمادی الثانی/ رجب ۱۴۱۵ھ دسمبر ۱۹۹۴ء

مدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ

تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی

طاہر مسعود

مجلس ادارت

منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

مصور

مومن رحیم

سرکولیشن مینجر

بابر فاروق

مینجر اشتہارات

عمران احمد

☆ ☆

قیمت

۱۲ روپے

۷ درہم ۷ ریال

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۹۴۸۲۱۰، ۴۹۴۲۸۵۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاہد علی ○ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

ڈاکیہ آیا آنکھ مچولی لایا

اگر آپ گھر بیٹھے آنکھ مچولی پڑھنا چاہتے ہیں
تو پھر اس کے سالانہ خریدار بنیئے

سالانہ ممبر شپ کے فائدے

96 روپے کی بچت ہوگی
بُک اسٹال کے چکر لگانے سے نجات مل جائے گی

آنکھ مچولی کے 12 عام شمارے
اور 2 خاص شماروں کی سالانہ قیمت 236 روپے
لیکن سالانہ خریداروں کے لیے صرف 140 روپے
سالانہ خریدار بننے کے لیے 140 روپے کا منی آرڈر کر دیجئے،
آنکھ مچولی آپ کو گھر بیٹھے ایک سال تک ملتا رہے گا۔

منی آرڈر کرنے کا طریقہ

اگر آپ "آنکھ مچولی" بذریعہ وی پی منگوانا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ایک خط لکھ دیجئے۔ ہم آپ کو رسالہ بھیج دیں گے۔ یہ رسالہ آپ کے علاقے کا ڈاکیہ آپ تک پہنچائے گا۔ رسالے کے ساتھ ایک وی پی فارم ہوگا۔ اس فارم پر رسالے کا سالانہ چندہ یعنی 140 روپے لکھ کر رقم آپ ڈاکیے کے حوالے کر دیں گے۔ آپ کی ادا کی ہوئی رقم محکمہ ڈاک کے ذریعے دفتر آنکھ مچولی پہنچ جائے گی۔ جس کی رسید آپ کو بھیج دی جائے گی اور یوں ہر مہینے آپ کو پابندی سے رسالہ ملتا رہے گا۔ فرض کیجئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ رسالہ راستے میں کبھی گم نہ ہو اور وقت پر آپ کو ملتا رہے تو پھر آپ کو رسالہ رجسٹرڈ ڈاک سے منگوانا چاہیئے اس کی رقم 200 روپے ہے۔

اِسے کہتے ہیں: مناسب دام بہت آرام

سنہرے حروف	ادارہ	۸
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۹
اصلی قائد (نظم)	رشید ارشد	۱۰
حق کی تلاش میں	حبیب صابر	۱۱
میں غلطی پر تھا	نسرین قادر	۱۴
قائد اعظم کی طلبہ سے محبت	عبدالستار خان طاہر	۱۷
بدلہ	محمد عظیم قریشی	۲۳
سالگرہ	مُنیر احمد راشد	۲۸
رحمان بابا، درویش خدامست	عابد سُلطان	۳۳
وہ کیا دن تھے؟ (نظم)	عمارہ احمد	۳۶
مومن کارومال	حسیب احمد	۳۸
مینگورہ سے وادئ اوشو تک	نیاز احمد خان	۴۱
رانگ نمبر	عبّاس عالم	۴۶
اللہ اکبر	عبد الباسط	۴۹
بے بس مسیحا	فاروق حسن چانڈیو	۵۱
شاید اسی وجہ سے (نظم)	عبد القادر	۵۴
ہنستے ہنستے	لطائف	۵۶
عینی کو ممی کا انتظار ہے	فائقہ رحمان	۶۰
گورکن بھنورا	فوزیہ شمیم	۶۵
صبح کے تحفے (نظم)	سیّد نظر زیدی	۶۸
ریڈ الی کی آمد	محمد عادل منہاج	۶۹
ہیرا کیوں چمکتا ہے؟	نگہت آرا چوہان	۷۷
نپولین، ایک عظیم جرنیل	قرۃ العین طاہر	۸۴
بنام آنکھ مچولی	خطوں کے جواب	۸۶
سردی (نظم)	پروفیسر عنایت علی خان	۹۰
عکس ادھورے کیجئے پورے	ادارہ	۹۱
آمنے سامنے	سلیم خالق	۹۴
بوڑھی زمین	آفتاب حسن	۹۹
تتلی (نظم)	محمد شاہد فیروز	۱۰۵
جھوٹ کا بدلہ جھوٹ	فرینک براو عظمی	۱۰۷
قلم دوست	ننھی تحریریں	۱۱۵

سنہرے حروف

حضرت امام حسنؓ ایک کھجور کے باغ کے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ایک حبشی غلام کو ایک گوشے میں بیٹھے دیکھا۔ وہ غلام روٹی کھا رہا تھا۔ پاس ہی ایک بھوکا کتا بیٹھا تھا۔ حبشی غلام روٹی کا ایک ٹکڑا خود کھاتا اور ایک ٹکڑا کتے کو کھلاتا جا رہا تھا۔

حضرت امام حسنؓ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور انہوں نے حبشی سے جا کر پوچھا: "تم کتے کو بھگا کیوں نہیں دیتے۔"

حبشی غلام نے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں خود روٹی کھاؤں اور بھوکے کتے کو بھگا دوں۔"

امام حسنؓ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس سے اس کے آقا کا نام پوچھا۔ غلام نے نام بتا دیا۔ امام حسنؓ نے فرمایا۔

"تم یہاں میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد حضرت حسنؓ واپس آ گئے اور غلام سے کہنے لگے۔ "میرے بھائی میں نے تمہیں اس باغ سمیت خرید لیا ہے۔ میں تمہیں آزاد کرتا ہوں اور یہ باغ تمہیں تحفتاً دیتا ہوں۔"

غلام بے حد مسرور ہوا۔ اس نے اٹھ کر حضرت امام حسنؓ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "حضرت چونکہ میں اب اس باغ کا مالک ہوں۔ میں اسے اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ نے بھی تو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے مجھے آزاد کیا ہے۔"

ماہِ رواں کی

پہلی بات

انسان کے بھی کتنے روپ ہیں۔ جب خوش ہوتا ہے تو ہنستا ہے، غم زدہ ہو تو روتا ہے اور کوئی بات مرضی کے خلاف ہو جائے تو غصے میں آ جاتا ہے۔ ہر روپ میں انسان کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ جب ہنستا ہے تو اس کا منہ کھل جاتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں، روتا ہے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور طیش میں آجائے تو چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور جھنجھلا کر چیخ پڑتا ہے۔ دیکھا جائے تو سب سے بری کیفیت، غصے ہی کی ہوتی ہے۔ کیونکہ غصے کی حالت میں انسان کو اپنی زبان اور اپنے ہاتھ پر قابو نہیں رہتا اور وہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے یا ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جس پر بعد میں اسے پچھتانا پڑتا ہے۔ چنانچہ بحث و تکرار گالم گلوچ اور مار پیٹ کے واقعات غصے ہی کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ غصہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کا سب سے زیادہ نقصان غصہ کرنے والے ہی کو پہنچتا ہے۔ اسی لئے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے پر قابو پانے کی تلقین کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ بہادر وہ نہیں ہے جو کسی پہلوان کو پچھاڑ دے بلکہ بہادر وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو پالے۔ غصے پر ہمیشہ صبر و تحمل کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔

غصہ ایک شیطانی فعل ہے — کیونکہ یہ شیطان ہی ہے جو آدمی کو غصہ کرنے پر ابھارتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ غصہ دور کرنے کا آسان سا طریقہ یہ ہے کہ دل ہی دل میں اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھ لیا جائے، غصہ فوراً رفوچکر ہو جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ غصہ ہر حالت میں ناجائز ہے۔ جہاں ملک و قوم اور اپنے دین کی حفاظت کا سوال آجائے، وہاں غصے کا اظہار ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے موقع پر بھی تہذیب و شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر تم کسی آدمی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو اسے غصے کی حالت میں دیکھو۔ گویا آدمی اچھا ہو گا تو غصے کی حالت میں بھی اس کی آواز دھیمی ہوگی، الفاظ شائستہ ہوں گے اور آپے سے باہر نہیں ہو گا۔ اور آدمی برا ہو گا تو غصے میں اور زیادہ برا نظر آئے گا۔ چیخ رہا ہو گا، بد کلامی کر رہا ہو گا اور ممکن ہے دنگا فساد پر بھی اتر آئے۔ اچھے لوگ وہی ہیں جو غصے میں بھی اچھے نظر آئیں۔

آپ کا دوست

طاہر مسعود

اصلی قائد

رشید ارشد

اللہ کا قرآن ہے،   اس پر مرا ایمان ہے.
قرآن کو جو مان لے،   وہ صاحب ایمان ہے
بندہ ہے وہ اللہ کا   جو عامل قرآن ہے
قرآن کے حافظ بہت!   حق بات کی پہچان ہے
میں حافظ قرآں بنوں   یہ میرا بھی ارمان ہے!
قرآن سے جو دور ہے   وہ بندۂ شیطان ہے
آئے گی محشر کی گھڑی   قرآن کا اعلان ہے
ہے آزمائش سے گھری   جنت کوئی آسان ہے؟
جو طالب جنت نہیں!   وہ احمق و نادان ہے
یہ دنیا کیا ہے، کچھ نہیں!   جنت میں ہر سامان ہے!
نیکی، بدی کے درمیاں   قرآن ہی فرقان ہے!
لوگو! کرو بخشش طلب!   اللہ بڑا رحمٰن ہے!
ایک ایک فرمان نبی ؐ   اللہ کا، فرمان ہے!
پیارے نبی ؐ ختم رسل ؐ   ہم سب کا یہ ایمان ہے
پورا سراپا آپ ؐ کا،   خود بولتا قرآن ہے!
قرآن ہے خود معجزہ!   کتنا عظیم الشّان ہے!
ہاں! اصلی قائد، رہ نما   قرآن ہے! قرآن ہے!
ماں باپ بھی، ارشد بھی خود   اللہ پر قربان ہے!

حق کی تلاش میں

ممتاز حبیب صابر

عرصہ گزرا فارس کے ایک گاؤں "جی" میں ایک جاگیردار رہا کرتے تھے اللہ کا دیا ان کے پاس سب کچھ تھا لیکن اولاد نہیں تھی۔ انہیں اولاد کی تمنا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے عرصہ بعد انہیں ایک بیٹے سے نوازا بیٹے کا نام انہوں نے "ہالہ" رکھا......
جاگیردار نے ان کی پرورش بڑے ناز و نعم میں کی۔ وہ اپنے بیٹے کا بے حد خیال رکھتے۔

ہالہ جب جوان ہو گئے تو ایک روز اپنے کھیتوں میں گئے وہاں راستے میں انہوں نے ایک عمارت دیکھی جس پر کراس (+) کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس عمارت سے گھنٹیاں بجنے کی سریلی آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز ہالہ کو اچھی لگی۔ وہ رک گئے اور پھر اس آواز پر کھنچتے ہوئے عمارت کے اندر پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے کچھ لوگوں کو عبادت کرتے ہوئے دیکھا۔ انہیں عبادت کا یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ وہ سارا دن وہاں رکے رہے۔ شام گھر واپسی پر انہوں نے اس واقعہ کا تذکرہ اپنے والد سے کیا۔ ان کے والد آتش پرست تھے۔ آگ کی پوجا

کرتے تھے۔ وہ ڈر گئے کہ کہیں ان کا بیٹا اپنا مذہب نہ چھوڑ دے چنانچہ انہیں زنجیروں سے باندھ دیا لیکن بالہ کسی طرح زنجیریں کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں حق کی تلاش تھی۔ وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے ایک گرجا گھر میں پہنچ گئے۔ وہاں انہیں ایک راہب ملا۔ انہوں نے راہب سے مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کیں پھر پوچھا "آپ کے مذہب کا اصل کہاں سے ہے؟" راہب نے انہیں شام کے شہر "ایلہ" کا نام بتایا (یاد رہے کہ "ایلہ" بیت المقدس کا پرانا نام ہے)

بالہ چھپتے چھپاتے "ایلہ" پہنچنے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہاں کا پادری انہیں پسند نہیں آیا کیوں کہ وہ لوگوں سے نذرانے وصول کر کے اپنے پاس جمع کر لیتا تھا...... بالہ کو پادری کے طور طریقے قطعاً پسند نہ تھے............ چند ہی دنوں بعد اس پادری کا انتقال ہو گیا تو اس کے نائب نے اس کی جگہ سنبھال لی۔ یہ اچھا آدمی تھا۔ جو نذرانے ملتے تھے لوگوں میں بانٹ دیتا تھا۔ بالہ جی جان سے اس کی خدمت کرنے لگے پھر جب اس پادری کا آخری وقت آیا تو اس نے بالہ کو ایک دوسرے پادری کے پاس بھیج دیا۔ بالہ اس دوسرے پادری کے پاس رہنے لگے...... یہ پادری بھی اچھی اچھی باتیں بتاتا تھا لیکن بالہ کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا سینہ خالی ہو۔ جب یہ پادری بھی مرنے لگا تو اس نے بالہ کو اپنے ایک شاگرد کے پاس بھیج دیا۔ بالہ اس کے ساتھ رہنے لگے۔ ایک دن اس نے کہا۔ "بالہ! مجھے معلوم ہے تمہیں حق کی تلاش ہے، میں تمہیں اس حق کی جگہ بھیج رہا ہوں۔ اس جگہ کا نام عرب ہے۔ وہاں ایک نخلستان ہے جہاں دو پہاڑ دائیں بائیں ہیں۔ وہاں کھجوروں کے باغ ہیں وہیں ایک "نبی" کا ظہور ہونے والا ہے۔

پادری نے انہیں ایک قافلے کے ساتھ کر دیا جو عرب جا رہا تھا۔ بالہ قافلے میں شامل تھے۔ ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر قافلے والوں نے انہیں ایک یہودی کے ہاتھ بیچ دیا وہ یہودی یثرب کا رہنے والا تھا (یاد رہے کہ یثرب مدینے کا پرانا نام ہے)۔ آپ نے جب یثرب کا علاقہ دیکھا تو یقین ہو گیا کہ یہی وہ علاقہ ہے جس کی نشاندہی پادری نے کی تھی۔ اب آپ یہودی کی خدمت گزاری میں لگ گئے۔ یہودی کے پاس آپ کو بے حد تکالیف کا سامنا تھا لیکن آپ یہ تکالیف ہنسی خوشی برداشت کرتے کیوں کہ آپ کو نبیؐ سے ملنے کا یقین ہو چلا تھا۔

اس یہودی کے پاس بالہ کافی عرصہ رہے۔ ایک روز آپ پیڑ سے کھجوریں توڑ رہے تھے کہ یہودی کا بھتیجا دوڑتا ہوا آیا اور ہانپتے کانپتے اطلاع دی کہ یثرب میں ایک شخص نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ بالہ نے جب یہ سنا تو درخت سے گرتے گرتے بچے فوراً درخت سے اترے اور پوچھا "کہاں ہے وہ نبی؟" یہودی کے بھتیجے نے ان کا

یہ اضطراب دیکھا تو زور سے ایک تھپڑ رسید کیا اور کہا۔ "اپنا کام کر۔ ہالہ تھپڑ کھا کر کام میں لگ گئے لیکن دل اندر سے بے چین ہو چلا تھا۔ ان کا دل کہہ رہا تھا کہ جس حق کی انہیں تلاش ہے وہ اس نبی کے ذریعے انہیں ضرور ملے گا۔ دل میں نبی سے ملنے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ شام ہوئی تو آپ نے چند کھجوریں لیں اور لوگوں سے پوچھتے پوچھتے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت اقدس میں جا پہنچے۔

راہب نے انہیں "نبی" کے بارے میں دو نشانیاں بتائی تھیں ایک یہ کہ نبی ہدیہ کی چیز کھا سکتا ہے لیکن کبھی صدقہ نہیں کھاتا۔ دوسری یہ کہ اس نبی کی پیٹھ پر ایک "مہر" ثبت ہوگی جو اس کے نبی ہونے کے دلیل ہوگی۔

ہالہ جب حضورؐ کی خدمت اقدس میں پہنچے تو حضورؐ اپنے جانثار ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہالہ نے حضورؐ کی خدمت اقدس میں کھجوریں پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ صدقہ ہے۔" حضورؐ نے کھجوریں اپنے ساتھیوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا "کھاؤ!" اور خود ہاتھ کھینچ لیا۔

ہالہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ راہب کی بتائی ہوئی ایک نشانی پوری ہو گئی تھی۔ دوسرے روز ہالہ پھر کچھ کھجوریں لے گئے اور یہ کہتے ہوئے حضورؐ کی خدمت اقدس میں پیش کیں کہ "ہدیہ ہے!" یہ سن کر حضورؐ نے کھجوریں ساتھیوں میں تقسیم کیں اور خود بھی کھائیں۔ اب ہالہ کا دل مطمئن تھا لیکن ابھی ایک نشانی باقی تھی۔ آپ حضورؐ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ حضورؐ چوں کہ اللہ کے نبی تھے۔ آپ کا مطلب سمجھ گئے اور پیٹھ کو برہنہ کر دیا۔

ہالہ نے مہر نبوت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ان کا سینہ خوشی و مسرت کے احساس سے بھر گیا۔ راہب کی بتائی ہوئی تمام نشانیاں سچ ثابت ہو گئی تھیں۔ ہالہ نے اسی وقت کلمہ پڑھا اور حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

ہالہ جو ایک آتش پرست کے بیٹے تھے لیکن جنہیں حق کی تلاش تھی۔ سچائی کو پانے کے لئے انہیں بار ہا مصیبتوں اور صعوبتوں سے گزرنا پڑا...... انہوں نے اپنی نوجوانی کے امنگوں بھرے دن حق کو پانے کے خاطر قربان کر دیئے۔

آقائے دو جہاں سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا۔ "یہ فارس (ایران) کا پہلا پھل ہے۔ اگر حق دنیا کے دوسرے کونے میں بھی ہوتا تو یہ تلاش کر کے ہی دم لیتے۔"

مسلمان ہونے کے بعد حضورؐ نے ہالہ کا نام حضرت سلمانؓ رکھا۔ چوں کہ آپ فارس کے رہنے والے تھے اس لئے سلمان فارسیؓ کے نام سے شہرت پائی۔ غزوۂ خندق جو کفار کے خلاف لڑی گئی اس میں خندق کی کھدائی کا مشورہ آنحضرتؐ کو حضرت سلمان فارسیؓ نے ہی دیا تھا۔

میں غلطی پر تھا

نسرین قادر

"وہ اِدھر ہی آرہا ہے ...... کیا خیال ہے اب اُٹھنا چاہئے۔" راشد نے سب کی طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"چلو!!" سب لڑکے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اتنے میں شفیع ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"کہاں جارہے ہو؟ میں تم لوگوں سے باتیں کرنے آیا تھا......"

"نہیں وہ ...... ہم سب آئسکریم کھانے جا رہے ہیں"۔ انور رُکھائی سے بولا۔

"میں اِدھر ہی لے آتا ہوں اپنے پیسوں سے ......!!" شفیع بڑی فیاضی سے بولا۔

"کیا خیال ہے ساتھیو! آئسکریم کا پروگرام کل پر رکھ لیتے ہیں۔ اس وقت اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔"

"ہاں یار! مجھے بھی ٹیوشن پڑھنے جانا ہے، دیر ہو جائے گی۔" انور اپنی عینک کو دُرست کرتے ہوئے بولا۔ اور پھر وہ ...... سب ہری ہری گھاس سے اُٹھتے ہوئے پارک سے باہر نکل گئے۔

شفیع ہکّابکّا کھڑا انہیں جاتا دیکھتا رہا۔

وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا کہ اس کے وہی دوست جو اس کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، کھاتے پیتے، گپیں لڑاتے تھے، اب اس سے کترائے کترائے پھر رہے تھے۔ اسکول میں بھی یہی معاملہ تھا۔ اسے اپنے قریب آتا دیکھ کر لڑکے ایک دوسرے کو مخصوص اشارے کرتے اور اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ لڑکوں کی اس حرکت پر شفیع کا دل دُکھ سا جاتا۔

"آخر یہ سب میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے

ہیں؟" شفیع بڑے دُکھ کے ساتھ سوچتا۔ "آخر مجھ سے ایسی کیا غلطی ہو گئی ہے؟" وہ لڑکوں سے اس بے رُخی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن وجہ تو اس وقت معلوم ہوتی جب کوئی اس کے قریب رکتا۔ لڑکے تو اسے دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔

شفیع اپنے گزشتہ رویئے پر غور کرتا تو ایسی کوئی بات نظر نہ آتی جس کی وجہ سے لڑکوں کی بے رخی کا مطلب سمجھ میں آتا۔ وہ تو ہمیشہ ہی سب کے کام آتا تھا۔ کسی کا ہوم ورک رہ گیا ہے، کسی کو جرنل خریدنے کے لئے پیسے چاہئیں۔ کسی کی فیس بھرنی ہے یا کسی کا بوتل پینے یا برگر کھانے کو جی چاہ رہا ہے تو شفیع یہ سب کام کرنے میں پیش پیش رہتا۔

وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے دوستوں پر پیسے خرچ کرنے میں کبھی بھی بخل سے کام نہ لیتا۔ دوسروں کے کام آکر اسے بے حد خوشی ہوتی تھی لیکن چند دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہی لڑکے جنھیں وہ اپنی جیب سے کھلاتا پلاتا تھا، جن کی فیسیں بھرتا تھا، اب وہی اس سے کھنچے کھنچے نظر آ رہے تھے۔

شفیع ہمیشہ لوگوں میں گھل مل کر رہنے والا لڑکا تھا۔ دوست جب اس سے الگ الگ ہوئے تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ اس صدمے سے وہ بیمار پڑ گیا۔ اور ایک ہفتے تک اسکول نہ جا سکا۔ اس کے گھر والوں نے اس کی بیماری کی درخواست اسکول بھجوادی۔ وہ کافی دن تک بخار میں پھنکتا رہا اور نیم بے ہوشی کی کیفیت میں یہی کہتا رہا۔ "تم لوگ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے..... آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" بیماری کے دوران شفیع سوچتا رہا کہ لڑکے اس کی عیادت کرنے گھر آئیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس بات سے اسے مزید دُکھ ہوا۔

پورے پندرہ دن بعد اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تھی۔

"ابو میں اسکول چلا جاؤں۔" شفیع نے کہا۔

"بھئی! کل چلے جانا..... میں تمہیں خود اسکول چھوڑ دوں گا۔" ابو نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ان کی گہری نظریں شفیع پر جمی ہوئی تھیں۔ شفیع کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ بیمار رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ پہلے سے خاصا کمزور بھی ہو گیا تھا۔ شفیع اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تو ابو ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر ڈاکٹر کی بات یاد کرنے لگے جس نے شفیع کو بخار میں بڑبڑاتا دیکھ کر کہا تھا کہ اس کی طبیعت کسی خاص صدمے کی وجہ سے خراب ہوئی ہے۔ پھر انہیں شفیع کے دوست راشد کی باتیں یاد آئیں جو کل شام شفیع کو دیکھنے گھر آیا تھا۔ اس وقت شفیع سو رہا تھا۔ راشد نے ابو سے کافی ساری باتیں کیں اور ابو کو ان باتوں کی روشنی میں شفیع کے بیمار رہنے کی اصل وجہ معلوم ہو گئی۔

"اور بھئی شفیع میاں! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" ابو شفیع کے بستر پر اس کے قریب بیٹھتے

ہوئے بولے۔

"میں ٹھیک ہوں ابو!" آہستہ سے شفیع نے کہا۔

ابو نے ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا پھر مسکراتے ہوئے شفیع سے کہا۔

"بھئی! اب سے کچھ دیر بعد آپ کے اسکول کے دوست آپ کی عیادت کو آرہے ہیں۔

"میرے دوست ...... اور میری عیادت کو ......!!

"ہاں بھئی! کل شام کو راشد بھی آیا تھا۔ آپ سو رہے تھے اس وقت۔ کافی ساری باتیں کیں اس نے۔ بھئی آپ کی تو وہ بہت تعریف کر رہا تھا البتہ ....!!" ابو رُک سے گئے۔

"اور ...... اور کیا کہہ رہا تھا راشد ابو؟" شفیع بے چین ہو کر تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"بھئی! وہ کہہ رہا تھا کہ آپ میں ایک بُری عادت ہے جس کی وجہ سے آپ کے دوست آپ سے کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔"

"کون سی بُری عادت ابو؟"

"بھئی! وہ بُری عادت یہ ہے کہ آپ کبھی کسی دوست کو کوئی چیز کھلاتے ہیں یا کسی کی کوئی مدد کرتے ہیں تو دوسروں کو بتاتے پھرتے ہیں اور کبھی تو اس دوست کو ہی جتا دیتے ہیں ...." ابو ایک لمحے کو خاموش ہوئے پھر دوسرے ہی لمحے بولے۔

"شفیع میاں! یہ تو بُری بات ہے۔ آپ کی اس حرکت سے آپ کے دوستوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، ان میں احساسِ ندامت پیدا ہوتا ہے۔"

ابو کی یہ بات سُن کر شفیع نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ ابو شفیع کے دونوں کاندھوں پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "اب تو آپ دوستوں کے ساتھ ایسا نہیں کریں گے ناں؟"

"نہیں ابو! مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میرے دوست مجھ سے ناراض کیوں تھے۔ اب ایسا نہیں ہو گا ابو!!" شفیع کی آنکھوں میں بہت سارے آنسو دیکھ کر ابو بولے۔ "رونا دھونا مت ...... آپ کے دوست آنے ہی والے ہیں۔" ابو نے شفیع کے آنسو پونچھ دیئے اور پھر کچھ دیر تک شفیع سے باتیں کرتے رہے پھر کمرے سے باہر نکلے تو شفیع کے دوست آگئے۔ راشد، انور، اظہر، سہیل، جمیل، سعید، اکرم، سب شفیع کے بستر کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

راشد نے شفیع کے ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔ "یار! معاف کر دینا ...... ہمیں معلوم ہے تمہیں ہماری حرکتوں کی وجہ سے دُکھ پہنچا ہے اور تمہاری بیماری کی وجہ بھی یہی ہے۔"

"نن ...... نن ...... نہیں تم لوگ تو بہت اچھے ہو ...... میں ہی غلطی پر تھا ...... لیکن اب ایسا نہیں ہو گا!! اتنا کہہ کر شفیع رو پڑا۔

روتے روتے اس نے دیکھا، کتنے ہی سارے رومال اس کے آنسو پونچھنے کے لئے اس کی طرف بڑھے ہوئے تھے ......!!!

قائداعظم کی طلبہ سے محبت

عبدالستار خان طاہر

مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کے بعد مسلم لیگ برصغیر میں ایک مضبوط جماعت کے طور پر اپنے قدم جما چکی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کی شہرت کا گراف روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مسلمانانِ ہند قائداعظم کو ایک سچا اور مخلص لیڈر مان چکے تھے اور انہوں نے اپنی تمام امیدیں اپنے عظیم قائد سے وابستہ کرلی تھیں۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کا اجلاس ناگپور میں ہوا۔ جس کا اہتمام وہاں کے طلبہ نے کیا تھا۔ ان کے لیڈر عبدالستار صدیقی تھے۔ عبدالستار صدیقی ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک سی۔ پی برار مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری رہے۔ ۱۹۴۱ء میں صوبہ برار میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا کوئی وجود نہ تھا اس کے باوجود انہوں نے طالب علم برادری کو جمع کیا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سربراہ محمد نعمان کو خط لکھا کہ ناگپور میں مسلم لیگ کا اجلاس رکھا جائے۔ جب یہ درخواست قبول ہو گئی تو انہوں نے قائداعظم کو لکھا کہ وہ اس اجلاس کی صدارت قبول فرمائیں۔ قائداعظم نے اس دعوت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے جواب میں لکھا کہ کسی فیصلے سے پہلے میری خواہش ہے کہ طالب علموں کا ایک وفد بمبئی میں آکر مجھ سے ملاقات کرے۔ طالب علم قائداعظم کی شخصیت سے مرعوب تھے۔ ان سے بات کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی اس لئے ان طالب علموں نے ضلعی مسلم لیگ کے صدر نواب صدیق علی خاں کو اپنے وفد کا لیڈر بنایا اور قائداعظم سے ملاقات کا وقت طے کر کے جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ابھی ملاقات میں ہفتہ کی مدت باقی تھی کہ بمبئی میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور وہاں روزانہ کرفیو لگنے لگا۔ یہ طالب علم بے حد پریشان ہوئے کہ کس طرح بمبئی پہنچیں۔ ابھی اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ قائداعظم کا ایک خط عبدالستار صدیقی کو ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ

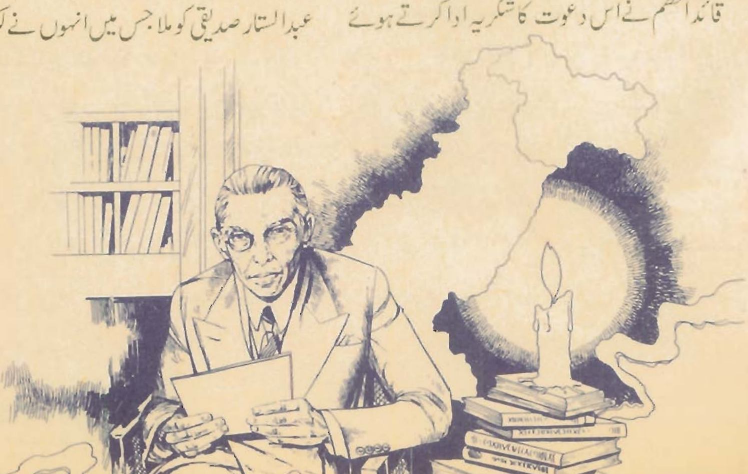

بمبئی میں شام چھ بجے سے صبح چھ بجے تک کرفیو لگا رہتا ہے۔ لیکن آپ لوگ مقررہ وقت پر تشریف لائیں کیونکہ میں نے پولیس کمشنر سے آپ کے لئے آمدورفت کا پروانہ (MOVEMENT PE-RMIT) حاصل کر لیا ہے۔ ناگپور میں بھی ایک مسلم لیگی کو ہندوؤں نے شہید کر دیا جس کی وجہ سے ناگپور کی فضا بھی خراب ہو گئی اس لئے نواب صدیق علی خاں طلبہ کے ساتھ بمبئی نہ جا سکے۔ طلبہ خود ہی بمبئی روانہ ہو گئے۔ یہ لوگ صبح بمبئی پہنچے۔ انہوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور چار بجے قائداعظم سے ملنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہ پانچ افراد تھے اور بمبئی میں ان دنوں ٹیکسی میں صرف چار سواریاں بٹھائی جاتی تھیں۔ ایک پٹھان ٹیکسی ڈرائیور کو جب پتا چلا کہ ان طالب علموں کو قائداعظم سے ملنے کے لئے ان کے بنگلے پر جانا ہے تو اس نے کہا۔ "آپ پانچوں میری ٹیکسی میں بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو واپس بھی خود ہی لاؤں گا۔ ممکن ہے اس طرح میں بھی قائداعظم کی زیارت کر سکوں۔"

پانچ بجے ان سے ملاقات کا وقت طے تھا۔ طالب علموں کو بٹھا دیا گیا۔ ٹھیک پانچ بجے قائد اعظم کمرے میں داخل ہوئے۔ طالب علموں نے اپنا تعارف کرایا تو قائداعظم نے پوچھا۔ "آپ اپنے ساتھ نواب صدیق علی خاں کو کیوں لا رہے تھے؟" پھر ہنس کر کہا۔ "کیا مجھے آپ بڑی سی توپ سے مرعوب کرنا چاہتے تھے۔" عبدالستار صدیقی نے جواب دیا۔ "سر! آپ سے ہماری ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی اس لئے ہم آپ سے مرعوب تھے اور رہنمائی کے لئے نواب صدیق علی خاں کو کہا تھا۔" قائداعظم نے یہ جواب سن کر کہا۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ طلبہ مجھے بے حد عزیز ہیں اور دوسرے لوگوں کی نسبت میں ان کی زیادہ عزت کرتا ہوں۔ میرے گھر کا دروازہ طلبہ کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔" جب طالب علموں کی ہچکچاہٹ کچھ دور ہوئی تو قائداعظم نے طلبہ سے پوچھا۔ "آپ اپنے صوبے میں تعمیری کام کرنے کے خواہاں ہیں یا کوئی بڑا تماشا دکھانا چاہتے ہیں؟" طالب علموں نے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ اس دوران چائے آ گئی۔ قائداعظم نے صوبے کی سیاسی صورت حال کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ بہت سے سوال پوچھے مختلف موضوعات پر گفتگو کے بعد قائداعظم نے اصل موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک آئینی مسئلہ ہے۔ میں صوبائی مسلم لیگ کے صدر کو لکھوں گا کہ وہ اجلاس کی صدارت کے بارے میں مجھے اپنی رائے سے مطلع کریں۔" طالب علموں کو اس جواب سے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ہاں مسلم لیگ میں گروہ بندی ہے اور بعض عہدے دار اس جلسے کے حق میں نہ تھے انہیں خطرہ تھا کہ صوبائی مسلم لیگ کا صدر قائداعظم کو یہ مشورہ نہیں دے گا کہ وہ طالب علموں کی اس دعوت کو قبول کریں۔ طالب علموں نے ڈرتے ڈرتے قائداعظم

سے عرض کیا۔ "سر! یہ معاملہ تو مشکل نظر آتا ہے۔ صوبائی مسلم لیگ کے صدر اس پر راضی نہیں ہوں گے۔" قائداعظم نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "میں مسلم لیگ کے آئین کا پابند ہوں۔ جس طرح ہندوستان کا وائسرے کسی صوبے میں جانے سے پہلے اس صوبے کے گورنر سے رابطہ قائم کر کے کلئیرنس (CLEAR-ANCE) حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح میرے لئے بھی یہ ضروری ہے۔" جب قائداعظم نے دیکھا کہ طالب علموں کے چہروں پر مایوسی بڑھتی جارہی ہے تو انہوں نے پوچھا۔ "آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" پھر خود ہی طالب علموں سے کہا۔ "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ صوبائی مسلم لیگ کا صدر مجھے وہاں آنے سے منع کر دے گا تو اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دیں۔ بہر حال اسے مطلع کرنا میرا فرض ہے۔" اس یقین دہانی کے بعد جب پونے آٹھ بجے قائداعظم سے ملاقات ختم ہوئی تو قائداعظم مسکرائے اور پٹھان ٹیکسی ڈرائیور کو بلوا کر اس سے مصافحہ کیا اور اس کا حال احوال پوچھا اور جاتے وقت کہا کہ کچھ لوگ میری کار میں جائیں گے اور کچھ لوگ ٹیکسی میں چلے جائیں۔" طلبہ کے جانے کے بعد قائداعظم نے صوبائی مسلم لیگ کے صدر سید عبدالروف شاہ کو خط لکھا اور اجلاس کے بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ سید عبدالروف شاہ نے چند ایک دشواریوں کا ذکر کیا۔ لیکن چونکہ قائداعظم طلبہ کا دل توڑنا نہ چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے جلسے میں شرکت کی ہامی بھر لی اور طلبہ کو خط کے ذریعے مطلع کر دیا اور یوں قائداعظم کا ناگپور میں تشریف لانا طے پا گیا۔ طلبہ نے انتظامات شروع کر دیئے۔ چندے کی فراہمی کی مہم کا آغاز ہوا۔ طالب علموں کو اس سلسلے میں ایک نئی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جہاں جاتے انہیں بتایا جاتا کہ قائداعظم تو وہاں بھی آرہے ہیں۔ اس لئے چندہ کیسے دیا جائے، انہیں تو خود چندے کی ضرورت ہے۔ عبدالستار صدیقی نے یہ صورت حال قائداعظم کو لکھ بھیجی۔ قائداعظم نے عبدالستار صدیقی کو پھر بمبئی بلایا اور ان سے پوچھا۔ "نوجوان! میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" عبدالستار صدیقی نے عرض کی۔ "سر اگر آپ ناگپور کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی جارہے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر آپ صرف ناگپور آرہے ہیں تو اس سلسلے میں ایک بیان جاری کر دیں۔"

"چونکہ یہ معاملہ عوامی نوعیت کا نہیں ہے۔ اس لئے میں بیان جاری نہ کر سکوں گا۔" قائداعظم نے کہا۔ "تاہم یہ طے ہے کہ میں صرف ناگپور جارہا ہوں۔" طالب علموں کو جو دشواری پیش آرہی تھی اس کا حل بھی قائداعظم نے خود ہی نکال لیا۔ انہوں نے عبدالستار صدیقی سے استقبالیہ کمیٹی کے لیٹر پیڈ پر لکھوایا۔ "اخبارات کے حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ناگپور کے بعد سی۔ پی برار کے چند دوسرے مقامات کا بھی دورہ کریں گے۔ آپ ہمیں مطلع فرمائیں کہ آپ

ہمارے صوبے کے کون کون سے مقامات پر تشریف لے جائیں گے تاکہ آپ کے پروگرام کی روشنی میں تمام انتظامات کئے جائیں۔ " اس خط کا جواب انہوں نے اپنے سیکرٹری مطلوب الحسن سید سے اسی وقت لکھوایا جس میں یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ وہ صرف ناگپور جارہے ہیں اور مصروفیت اور صحت کی خرابی کی وجہ سے کسی دوسری جگہ نہ جا سکیں گے۔ " عبدالستار صدیقی ناگپور پہنچے۔ انہوں نے قائداعظم کے اس خط کی تشہیر کر دی۔ یوں چندہ جمع ہونے لگا۔ عبدالستار صدیقی اور محمد نعمان نے ڈپٹی کمشنر مسٹر فرکوہر سے ناگپور کی مشہور جگہ "کستور چند پارک" میں جلسہ کرنے کی اجازت مانگی۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا۔ لیکن آخر کار صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے جلسے کی اجازت دے دی۔ چونکہ ناگپور اجلاس میں قائد اعظم کے ساتھ ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان بھی آرہے تھے اور چونکہ ناگپور میں اچھے ہوٹل نہیں تھے اس لئے ان طالب علموں نے فیصلہ کیا کہ اس وجہ سے ان کی رہائش کا انتظام کسی مکان میں کیا جائے۔ طالب علموں کو معلوم ہوا کہ سول ایریا میں ایک پارسی بہرام جی کا ایک بنگلہ خالی پڑا ہے۔ طالب علم بہرام جی سے ملے وہ اپنا بنگلہ اس شرط پر کرائے پر دینے پر آمادہ ہوا کہ بنگلہ ۳۱ دسمبر کو خالی کر دیا جائے کیونکہ یکم جنوری کو وہاں کوئی کرایہ دار آرہا تھا۔ طالب علموں نے سوچا کہ ۲۵ دسمبر کو اجلاس ہے۔ اور ۲۸ دسمبر کو قائداعظم وہاں سے چلے جائیں گے۔ اس لئے وہ بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ پارسی بہرام جی نے طالب علموں سے ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ وصول کیا۔ قائداعظم ان کی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان کو اس بنگلے میں ٹھہرایا گیا۔ ۲۵ دسمبر کو جو کہ قائداعظم کی سالگرہ کا دن تھا وہ ناگپور پہنچے۔ ناگپور شہر میں آبادی کے اعتبار سے مسلمان صرف بیس فیصد تھے۔ اسی فیصد آبادی غیر مسلموں کی تھی۔ مگر قائداعظم کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر اتنی خلقت جمع تھی کہ شمار کرنا مشکل تھا۔ مسلمان دوسرے اضلاع سے جوق در جوق قائداعظم کے استقبال کے لئے ناگپور پہنچ گئے تھے۔ پلیٹ فارم انسانوں سے بھر گئے تھے۔ گاڑی رکی تو سٹی مسلم لیگ کے صدر "ابراہیم فنا" قائداعظم کو اپنی حفاظت میں اتارنے کے لئے ڈبے کے قریب پہنچے تو دھکم پیل میں ان کی انگلی ڈبے کے دروازے میں پھنس گئی اور اچھی خاصی زخمی ہو گئی۔ تکلیف کی وجہ سے وہ تلملا اٹھے۔ قائداعظم کی تیز نگاہوں نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ خاموش رہے۔ انسانوں کا ہجوم بے قابو ہو چکا تھا۔ ہر شخص قائداعظم کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ قائداعظم کو ریلوے اسٹیشن سے باہر لانے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ قائداعظم کو ایک کھلی کار میں سوار کرایا گیا۔ اگلی نشست پر ایک باڈی گارڈ بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر قائداعظم کے پاس بیٹھنے کا شرف عبدالستار صدیقی کو حاصل ہوا۔ دو گاڑیاں قائداعظم والی گاڑی کے آگے اور دو پیچھے

تھیں۔ ’’اللہ اکبر‘‘ اور ’’قائداعظم زندہ باد‘‘ کے نعروں سے سارا ناگپور گونج اٹھا۔ مسلمانوں نے اپنے قائداعظم کا بارہ میل لمبا جلوس نکالا اور یہ فاصلہ تین گھنٹوں میں طے ہوا۔ جس بنگلے میں قائداعظم کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا وہاں پہنچ کر قائداعظم نے پوچھا۔ ’’میرے ساتھ اس بنگلے میں کون کون ٹھہرے گا؟‘‘ جب انہیں محترمہ فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان کے بارے میں بتایا گیا تو کہنے لگے۔ ’’امیر کہاں ٹھہرے گا؟‘‘ ان کا اشارہ راجہ صاحب محمود آباد کی طرف تھا۔ طالب علموں نے بتایا کہ ان کی رہائش کا انتظام کسی ہوٹل میں کیا گیا ہے۔ قائداعظم نے کہا۔ ’’نہیں! امیر بھی یہیں ٹھہرے گا۔‘‘ طالب علموں نے اپنے قائداعظم کے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور راجہ صاحب محمود آباد کی رہائش کا بھی وہیں انتظام کر دیا۔ قائداعظم کے سیکرٹری مطلوب الحسن سید کے لئے اسٹڈی روم (STUDY ROOM) میں ہی پلنگ اور میز کرسی کا انتظام کر دیا گیا۔ قائداعظم کی سواری کے لئے ہارون سیٹھ نے اپنی کار دے دی تھی، بلکہ ان کے بیٹے سیٹھ صالح محمد نے خود یہ پیش کش کی کہ قائداعظم جتنے دن ناگپور میں ٹھہریں گے وہ ان کے شوفر کی حیثیت سے فرائض انجام دیں گے۔ قائداعظم ’’شوفر‘‘ کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوئے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ وہ شوفر نہیں بلکہ لکھ پتی ہے اور آپ کی محبت اور عقیدت کی وجہ سے یہ فرض انجام دے رہا ہے تو قائداعظم نے

سیٹھ صالح محمد سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ ناگپور کے اجلاس میں قائداعظم کی سرکردگی میں متعدد قرار دادیں منظور کی گئیں۔ مسلمانانِ ہند کے مختلف مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا۔ اور حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان مسائل کو جلد سے جلد حل کرے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ناگپور کا اجلاس ختم ہو گیا۔ خواجہ ناظم الدین، نواب زادہ لیاقت علی خان، حاجی ستار الحق سیٹھ، راجہ صاحب محمود آباد اور ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی وغیرہ مسلم لیگی رہنماؤں نے اگلے دن ۲۸ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ناگپور سے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر قائداعظم نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا انہوں نے طالب علموں سے کہا۔ ’’آپ کا شہر ناگپور بڑا پرسکون اور خاموش ہے۔ مجھے یہ شہر بہت پسند آیا ہے۔ فاطمہ اور میں نے عیدالاضحیٰ یہیں آپ کے ساتھ منانے کا فیصلہ کیا ہے۔‘‘ طالب علم یہ سن کر بے حد خوش ہوئے لیکن یہ پریشانی بھی لاحق ہوئی کہ عیدالاضحیٰ ۲۹ دسمبر کو تھی اگر قائداعظم اس کے بعد دو چار روز ٹھہرے تو ان کے قیام کا کیا انتظام کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ بنگلہ تو یکم جنوری سے پہلے خالی کرنے کا وعدہ کیا جا چکا تھا۔ طالب علموں نے اس پریشانی کا اظہار قائداعظم سے نہ کیا۔ وہ بنگلے کے پارسی مالک بہرام جی سے ملے اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ پارسی بہرام جی نے کہا کہ ان کا جو کرایہ دار بنگلے میں یکم تاریخ کو آ رہا ہے اس سے جا کر بات کر لیں۔ یہ صاحب ایک عیسائی تھے۔

جب انہیں پتہ چلا کہ جس بنگلے میں وہ منتقل ہونے والا ہے۔ وہاں قائداعظم ٹھہرے ہوئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اجازت دے دی کہ قائداعظم جب تک چاہیں وہیں قیام کریں، اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا بلکہ وہ خوشی محسوس کرے گا۔ عیدالاضحیٰ کی نماز کا انتظام اسی "کستور چند پارک" میں کیا گیا۔ جہاں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تھا۔ ناگپور کی دوسری عید گاہوں میں لوگوں کی حاضری بڑی کم رہی۔ کیونکہ تمام لوگ قائداعظم کے ساتھ نماز عید ادا کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے اضلاع سے بھی لوگ وہاں پہنچ گئے تھے۔ عیدالاضحیٰ کی نماز کے موقع پر نمازیوں کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ وہ قائداعظم سے مصافحہ کرے اور عید ملے۔ قائداعظم نے یہ صورت حال دیکھی تو مائیک پر تشریف لائے اور اردو میں کہا۔ "آپ سب کو عید مبارک۔" ہزاروں انسانوں کے مجمع نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ "آپ کو بھی عید مبارک۔" اس کے بعد قائداعظم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ سب لوگوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو میرا ہاتھ یہیں رہ جائے گا۔" لوگ یہ سن کر ہنس پڑے۔ اس کے بعد قائداعظم نے ناگپور میں جو ایام گزارے ان میں وہ سیٹھ صالح محمد کو ساتھ لے کر سول لائنز یا گلف گراؤنڈ کی سیر کو ضرور جاتے تھے۔ ایک دفعہ محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ شاپنگ کے لئے بھی گئے۔ ناگپور کے طالب علموں نے قائداعظم کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ وقت کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ اس کا تجربہ بھی انہیں ہو گیا۔ اجلاس کے آخری روز مقامی طلبہ کے ساتھ شام پانچ بجے ملاقات کا وقت طے تھا۔ طالب علم اجلاس کی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے پندرہ منٹ دیر سے پہنچے۔ قائداعظم نے کہلوا دیا کہ وہ آج ملاقات نہیں کریں گے کل آیئے گا۔ دوسرے روز ملاقات پر انہوں نے طالب علموں سے کہا۔ "میں اگر کل آپ سے نہیں ملا تو اس کے پیچھے آپ کی بہتری کا جذبہ کار فرما تھا۔ آپ نوجوان ہیں آپ کو سب سے زیادہ وقت کی قدر و قیمت اور پابندی کا احساس ہونا چاہئے۔" قائداعظم عید کے روز ہی شام کو بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔ طالب علم انہیں الوداع کہنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر گئے۔ گاڑی آئی، قائداعظم اور محترمہ جناح اس میں سوار ہو گئے۔ قائداعظم نے سب پر ایک نگاہ ڈالی۔ "محمد ابراہیم فنا" بھی وہاں کھڑے تھے۔ جن کی انگلی زخمی ہو گئی تھی۔ قائداعظم نے اشارے سے انہیں قریب بلا کر کہا۔ "مجھے اپنی انگلی دکھائیے۔" محمد ابراہیم نے اپنی انگلی دکھائی جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ قائداعظم مسکرا دیئے اور انہوں نے محمد ابراہیم فنا کی حوصلہ افزائی کی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ قائداعظم نے سب کو سلام کیا اور پھر ٹرین مسلمانوں کے اس عظیم قائد کو لئے ناگپور ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہو گئی۔

بدلہ

کہانی: عبدالمجید سندھی
ترجمہ: محمد عظیم قریشی

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔ میں اپنی آبائی زمینوں پر زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے گیا۔ میرے ساتھ میرا چھوٹا بیٹا بھی تھا۔ جس کی عمر تقریباً دس سال تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی ان زمینوں کے کام سے مانوس ہو جائے جو اس ہی کی ملکیت تھیں اور جوان ہو کر اسے ہی سنبھالنا تھیں۔

جب ہم تھکے ماندے زمینوں پر پہنچے تو کسانوں نے اپنے گھر کے سامنے چارپائیاں بچھا دیں اور میری سفر کی ساری تھکان ان سادہ اور بھولے بھالے کسانوں سے باتیں کر کے دور ہو گئی۔

باتیں کرتے کرتے جب کچھ دیر بعد میں نے ادھر ادھر دیکھا تو میرا بیٹا وہاں سے غائب تھا۔ میرے پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ

"سائیں! اسے علو (علم دین) کمدار اپنے گھر لے گیا تھا۔"

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میرا بیٹا جلد ہی ان لوگوں میں گھل مل گیا ہے جو اس کے اپنے ہیں۔

کچھ دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک ہرنی کے

بچے کے ساتھ کھیلتا ہوا آرہا ہے۔ "ارے بیٹا! یہ کس کی ہرنی پکڑ لائے ہو۔" میں نے پوچھا

"بابا سائیں! یہ ہرنی مجھے کمدار چاچا نے لاکر دی ہے، یہ غلامو ہاری کے بیٹے کی ہے۔ وہ تو دے ہی نہیں رہا تھا لگاتار روئے چلا جارہا تھا۔ کمدار چچا نے اسے ڈانٹ کر یہ ہرنی مجھے دلا دی۔"

یہ سن کر میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

"بیٹا یہ ہرنی پرائی ہے۔ غلامو کے بیٹے سے تمہیں یہ ہرنی نہیں لانا چاہئے تھی۔" میں کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "بابا! یہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے، میں اسے ساتھ لے جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی التجا بھری آنکھیں نم ہو گئیں۔

میں نے کمدار کی جانب نظر دوڑائی تو علو کمدار کہنے لگا۔

"سائیں! ایسی کون سی بات ہے ہمارا سب کچھ آپ کا تو ہے۔ ہم لوگ، یہ زمینیں، یہ گاؤں سب آپ ہی کا ہے۔ یہ ہرنی ان کے مقابلے میں کیا چیز ہے۔ سائیں غلامو کے رشتے دار پہاڑیوں پر رہتے ہیں۔ آپ حکم کریں تو وہ بہت سی ہرنیاں پکڑ لائیں گے۔" علو کمدار کی بات سن کر غلامو بولا: بڑے سائیں، چھوٹے سائیں پر ایک کیا سو ہرنیاں قربان کر دوں۔ دراصل اس ہرنی کو میرے بیٹے نے بڑی محبت سے پالا تھا اس لئے رو رہا تھا۔ میں اسے دوسری ہرنی منگوا دوں گا۔ بس اب یہ ہرنی تو چھوٹے سائیں کی ہوگئی۔"

میں گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ علو کمدار، غلامو، علن جانو منٹھار، رحیمو اور گلو ہاری باری باری باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کی باتیں کیا سنتا۔ میرا دھیان تو کہیں اور تھا۔ میری آنکھیں اپنے بیٹے پر تھیں جو اس ہرنی کے بچے کے ساتھ کھیل میں مگن تھا۔ اسے دیکھ کر میرا بچپن میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ تصور میں اپنے بیٹے کی جگہ خود کو کھیلتا ہوا محسوس کرنے لگا فرق تھا تو صرف زمانے کا۔ باقی سب کچھ تو وہی تھا بالکل اسی طرح۔

تصور کی نگاہوں میں جھیل کے پہلو میں سمٹے ہوئے کالے پہاڑ، پہاڑوں کے دامن میں تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے چٹیل میدان اور بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا گاؤں گھوم گیا۔

اس گاؤں میں مٹی سے بنے ہوئے کچے مکانات سے ذرا دور ایک سرکاری بنگلہ اور ملازمین کے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ میں بھی اسی ماحول کا ایک جیتا جاگتا فرد تھا۔ میرے ساتھ ایک چھوٹی سی ہرنی تھی۔ نام تھا اسکا "کونجڑی۔" میں اس کے ساتھ کھیلتا تھا، اس کو بھگاتا تھا، اس کو تھپتھپاتا تھا۔ مجھے اس کی آنکھیں بے حد پیاری لگتیں۔

میں جب بابا سائیں سے اس کی تعریف کرتا تو وہ ہنس کر اماں کو کہتے کہ "تمہارا بیٹا تو شاعر بنے گا۔ ایک دن میں اسی طرح ہرنی سے کھیل میں مگن تھا کہ بلاول دوڑتا ہوا آیا اور ہرنی کو رسی سے کھینچ کر لے جانے لگا اور کہنے لگا "یہ ہرنی میری ہے اب میں تمہیں نہیں دوں گا۔ تم اسے سارا دن

دوڑاتے ہو دیکھو تو کیسی تھک گئی ہے یہ بے زبان میری ہرنی۔" میں نے آگے بڑھ کر رسی پکڑنی چاہی لیکن کہاں میں ایک افسر کا بیٹا اور کہاں وہ دیہات کی کھلی فضاؤں میں پلا ہوا مضبوط کاٹھی کا بچہ۔ اس نے مجھے دھکا دیا تو میں دور جا گرا اور پھر روتا ہوا بابا سائیں کے پاس شکایت لے کر گیا۔

بابا سائیں ضلع کے بڑے افسر تھے اور بلاول ایک پٹے والے کا بیٹا۔ وہ بھلا میرا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہرنی ہمارے بنگلے میں پہنچا دی گئی۔

بلاول کا کوارٹر زیادہ دور نہ تھا۔ رات بھر اس کے رونے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ مسلسل یہی کہے جا رہا تھا

"بابا! میری ہرنی۔ میری کونجڑی۔ بابا کونجڑی" اس کا باپ اپنے بچے کی چیخ و پکار سنتا رہا اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ اپنے افسر تک اپنے بیٹے کی فریاد پہنچاتا۔ دوسرے دن بلاول کو بخار ہو گیا۔ وہ بخار میں تپ رہا تھا۔ میں ہرنی لے کر اس کے پاس گیا اور کہا۔ "چلو پہلے کی طرح ہم دونوں کھیل لیتے ہیں۔"

لیکن اس نے ایک نہ سنی بس اس بات کی تکرار کئے جا رہا تھا کہ کونجڑی میری ہے صرف میری ہے۔

اس پر اور کوئی قبضہ نہیں جما سکتا۔

شام ہو گئی، میں بنگلے کے احاطے میں اپنی پیاری ہرنی سے کھیل رہا تھا کہ بلاول دوڑتا دوڑتا آیا اور کہنے لگا۔ "اب یہ ہرنی میری ہو گئی ہے۔ میری ماں نے بیگم صاحبہ سے کہہ کر ہرنی مجھ کو دلا دی ہے۔ دو مجھے یہ ہرنی میری ہے۔"

میں نے نظر اٹھا کر بنگلے کی طرف دیکھا۔ اماں مجھے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ مجھ کو یاد آیا کہ بابا سائیں تو دورے پر گئے ہوئے ہیں اب میری ہرنی مجھ سے چھین لی جائے گی۔ کیونکہ اب میری حمایت کون کرے گا۔ نہ جانے اس وقت مجھے کیوں اپنی بے عزتی معلوم ہوئی۔ اسی وقت میں نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔

میں چپ چاپ چبوترے پر چڑھ گیا اور ایک بھاری پتھر اٹھا کر ہرنی پر دے مارا۔ اس سے پہلے کہ ہرنی ہوشیار ہو جاتی۔ پتھر اپنا کام کر چکا تھا۔ ہرنی کا سر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس ہرنی کی وہ آنکھیں آ گئیں جن میں التجائیں تھی۔ اس وقت مجھے بلاول کی آنکھوں اور ہرنی کی آنکھوں میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔ آج میرا اپنا بیٹا ایک ہرنی غلامو کے بیٹے سے چھین کر لایا تو میں لرز کر رہ گیا۔ میرے ماضی کا سایہ مجھے حال پر پڑتا دکھائی دیا۔

بیتی ہوئی تلخ یادوں سے چونک کر میں نے غلامو اور پھر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جو مجھ سے کہہ رہا تھا "بابا سائیں وہ ہے غلامو کا بیٹا۔" میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا تو ایک چھوٹا لڑکا اپنے کاندھے جھکائے ہاتھ میں چھوٹی کلہاڑی لئے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ غلامو نے اسے پکارا تو اس نے مڑ

گدگدی کا مزا

ایک موٹر سائیکل سوار ڈیوڈ گرین کو شرارت کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اور وہ زخموں سے چور ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ گرین کو کیلی فورنیا کی ایک سڑک پر موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے ایک کار نظر آئی جس پر پچھلی نشست پر ایک شخص کھڑکی سے پاؤں باہر نکالے بیٹھا تھا۔ گرین کو یہ دیکھ کر شرارت سوجھی اور اس نے موٹر سائیکل قریب لے جا کر اس شخص کے پاؤں میں گدگدی کرنے کی کوشش کی لیکن سامنے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار کار سے ٹکرا گیا اور زخموں سے چور ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔

مرسلہ ...... عبدالباسط، ہری پور۔

کر دیکھا کچھ دیر ساکت کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ ہماری طرف آیا۔ اس کی آنکھیں روتے روتے لال سرخ ہو چکی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔

"بیٹا ادھر آؤ۔ تمہیں ہرنی چاہئے؟" میرے بیٹے نے یہ سن کر زور سے چیخ مار کر کہا کہ "بابا میں یہ ہرنی کسی کو نہیں دوں گا۔" میں نے دیکھا غلامو کے بیٹے کی آنکھوں میں جو چمک آئی تھی وہ فوراً ہی ختم ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں مایوسی نے جگہ لے لی۔

"سائیں چھوڑیں اسے، یہ ہرنی چھوٹے سائیں کی ہے۔" پھر غلامو اپنے بیٹے کو ڈانٹ کر بولا "جاجا بکریوں کو دیکھ۔ خیال رکھیو ذرا۔" میں نے اسے روکا "بیٹے ٹھہرو۔ ہم یہ ہرنی تم سے لیں گے مگر...... مگر ایسے نہیں، یہ لو پچاس روپے۔ ان سے دوسری ہرنی لے لینا یہ کہہ کر میں نے پیسے اس کی طرف بڑھائے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے نوٹ ہاتھ میں لے کر ہرنی کی طرف دیکھا جو درخت سے بندھی ہوئی بیٹھی تھی۔ یکایک اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ صدا تھی اور نہ ہی التجا۔ البتہ جوش اور بغاوت کے شعلے ضرور تھے جو یکایک بھڑک اٹھے تھے۔

وہ ہرنی کی طرف لپکا، اس کی دوڑ، پھرتی اور تیزی حیران کن تھی۔ اس نے کلہاڑی کے ایک ہی وار سے ہرنی کا سر تن سے جدا کر دیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ اس کی آنکھوں نے مجھ سے کیا کہا یہ تو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ خون آلود کلہاڑی اس نے ایک طرف پھینک کر نوٹ کو پرزے پرزے کر دیا اور چیختا چلاتا ہوا کھیتوں میں گم ہو گیا۔ میں ہرنی کے پاس گیا، آنکھوں میں وہی صدا تھی، وہی التجا، شاید سب ہرنیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں مگر انسان کتنا مختلف ہے؟ میرے سامنے بلاول کی آنکھیں آئیں پھر غلامو کے بیٹے کی۔ کتنا فرق تھا دونوں کی آنکھوں میں۔ میں نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا وہ ہرنی کے ساتھ لپٹا ہوا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا بیٹا بلاول بن گیا ہو۔

پاکستان کی واحد پروڈکٹ

ڈنٹونِک

جسے اعلیٰ ترین کوالٹی کی بنیاد پر "یوروپین کوالٹی ایوارڈ" دیا گیا۔
واضح رہے کہ یہ بین الاقوامی اعزاز اب تک پاکستان میں صرف
ڈنٹونِک کو ملا ہے۔ اس سے آپ خود ڈنٹونِک کی خوبیوں اور اسکی
عالمگیر شہرت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

ڈنٹونِک

دُنیا کا مُفید ترین ٹوتھ پاؤڈر

اعلےٰ کیمیکلز پوسٹ بکس 2110 کراچی 74600

ORIENT/McCANN

سالگرہ

منیر احمد راشد

"کیا کہہ رہا تھا وہ موٹو؟"

"کچھ نہیں ...... وہی پرانی رٹ ...... مکھی چوس کہیں کا۔"

تیمور کے پوچھنے پر سلمان نے ناک چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ لوگ اس وقت اسکول کے گیٹ سے نکل رہے تھے۔ چھٹی ہوئے آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ مگر سلمان، عمران سے باتوں میں ایسا الجھا کہ پورا آدھا گھنٹہ ضائع ہو گیا۔

یہ ایک پرائیوٹ اسکول تھا۔ انگلش میڈیم سیکنڈری اسکول۔ تیمور، سلمان، عمران، عادل اور فواد دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ سب کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے تھے۔ اور آپس میں ان کی دوستیاں بھی تھیں۔ عمران حد سے زیادہ کفایت شعار تھا اس لئے دوستوں میں "کنجوس مکھی چوس" کے نام سے پکارا جاتا تھا اور عادل کو یہ

لوگ پروفیسر کہتے تھے۔

عادل ایک دبلا پتلا، کمزور سا لڑکا تھا۔ رنگ گورا نقوش اچھے، میانہ قد اور بہت ہی کم گو۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس نے بلا کسی شدید ضرورت کے خود کسی سے بات کی ہو۔ کوئی اس سے کچھ پوچھتا تو وہ جواب دے دیتا تھا۔ اور وہ بھی اتنی آہستہ آواز میں کہ سننے والے کو "بہت زور سے" سننا پڑتا تھا۔

پڑھائی میں تو خیر سبھی دوست اچھے تھے۔ مگر عادل اس معاملے میں سب سے اچھا تھا۔ وہ فضول قسم کی گفتگو یا بے کار مشاغل میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اکثر مطالعے میں غرق رہتا تھا۔

وہ ہر موضوع پر کتابیں پڑھتا تھا۔ لیکن تاریخ سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ اسی لئے بعض دوستوں کا خیال تھا کہ وہ ماضی میں زندہ ہے۔ جب کبھی کوئی دوست اس حوالے سے عادل پر طنز کرتا تو وہ صرف مسکرا کر رہ جاتا۔ ممکن ہے وہ بہت مدلل اور طویل جواب دینے کی خواہش بھی رکھتا ہو۔ اور اپنے وسیع مطالعے کی وجہ سے یہ اس کے لئے مشکل بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے بولنے کا کچھ ایسا زیادہ شوق نہیں تھا۔ لہذا وہ ہر طنز کا جواب مسکراہٹ سے دے کر بحث کا دروازہ ہی بند کر دیتا تھا۔

اس کی اصل دوستی تو خیر کتابوں ہی سے تھی لیکن تیمور، فواد اور سلمان سے بھی اس کا تعلق کوئی سرسری نہیں تھا۔ وہ عمران کی طرح کنجوس بھی نہیں تھا۔ اس لئے دوستوں کے ساتھ تقریبات میں آنے جانے اور تحائف کے تبادلوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

اس وقت بھی جب سلمان اور تیمور، عمران کی کنجوسی پر ہنس رہے تھے، عادل ان کے ساتھ تھا۔ وہ لوگ فواد کے گھر جارہے تھے۔ جہاں آج شام اس کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ سلمان نے عمران کو بھی سالگرہ میں چلنے کی دعوت دی تھی جس پر اس نے سلمان کو ایک لمبا سا لیکچر سنا دیا تھا سلمان ان دونوں کو اسی لیکچر کی خاص خاص باتیں بتا رہا تھا۔

"کہنے لگا سالگرہ تو عیسائیوں کی رسم ہے۔" سلمان نے عمران کی نقل اتاری۔ "بہانے باز..... اگر سالگرہ میں تحفہ دینے کے بجائے صرف کھانے پینے کا چکر ہوتا تو موصوف سب سے پہلے دوڑتے دوڑتے آتے۔"

"ہاں اور کیا..... دیکھا نہیں تھا اس دن..... پھوپھو کے ولیمے میں..... کیسے دونوں ہاتھوں سے مرغی ٹھونس رہا تھا۔" تیمور نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

توبہ ہے بھئی..... کھانے پر تو ایسا مرتا ہے..... اور جیب سے ایک پھوٹی کوڑی نہیں نکلتی..... کنجوس..... کہتا ہے میں دوپہر میں کھانا نہیں کھاتا..... اس لئے لنچ باکس نہیں لاتا ہوں..... اور اس دن عادل کا سارا لنچ ایک منٹ میں صاف کر گیا۔" سلمان نے کہا۔

"رہنے دو سلمان ...... کسی کی غیبت نہیں کرتے ...... بری بات ہوتی ہے۔" عادل نے اپنے مخصوص انداز میں دھیرے سے کہا۔ تیمور جو کچھ کہنے کے لئے منہ کھول چکا تھا ایک دم چپ ہو گیا۔ چند لمحے یہ خاموشی رہی، پھر سلمان ہی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ شاید عمران سے ہونے والی باتوں کا اثر بہت شدید تھا۔

"چلو ہم غیبت نہیں کر رہے ...... لیکن تم ہی بتاؤ ...... یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

"نہیں ...... بخیل آدمی کو تو اللہ تعالیٰ بھی پسند نہیں کرتے۔" عادل نے کہا۔ "لیکن سالگرہ کے بارے میں عمران نے غلط نہیں کہا ...... یہ تم لوگ بھی جانتے ہو۔"

"ہم جانتے ہیں ...... لیکن یہ صدیوں سے ہمارے ہاں رائج ہے ...... اور اب ہماری ثقافت کا حصہ بن چکی ہے۔ ثقافت سے رشتہ توڑنا اور رسموں کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر سالگرہ ہی کیوں اور بھی ہزاروں چیزیں جو ہم نے عیسائیوں اور یہودیوں سے لی ہیں ...... سب کو چھوڑنا چاہئے۔"

"سب سے پہلے تو عمران کو پینٹ شرٹ اور ٹائی یعنی اسکول یونیفارم سے توبہ کرنی چاہئے۔" تیمور نے ہنستے ہوئے کہا۔ مگر سلمان ابھی تک سنجیدہ تھا۔ بولا۔ "لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ انگریزی تہذیب کے ہم عادی ہو چکے ہیں اور اسے ایک دم چھوڑ دینا ممکن نہیں ...... البتہ ہم اتنا ضرور کر سکتے ہیں ان موقع پر فضول خرچی سے پرہیز کریں۔"

سلمان کی عالمانہ تقریر کے جواب میں عادل نے صرف مسکرانا کافی سمجھا کیونکہ وہ سالگرہ کو محض فضول خرچی سمجھتا تھا۔ اور یہ بات سلمان اور تیمور کو بھی معلوم تھی۔

وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے فواد کے گھر پہنچ گئے۔ فواد نے ان کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا تھا۔ تقریب میں ابھی کافی دیر تھی۔ یہ لوگ پہلے اس لئے پہنچ گئے تھے کہ تقریب کی تیاری میں فواد کا ہاتھ بٹا سکیں۔ انہوں نے اپنے لائے ہوئے تحفے بھی پہلے ہی سے فواد کے حوالے کر دیئے تھے۔ چھوٹے موٹے کام کے ساتھ باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سلمان کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جلد ہی گفتگو کا رخ عمران کی طرف اور پھر وہاں سے سالگرہ کے موضوع کی طرف مڑ گیا۔ اب فواد بھی اس بحث میں شامل ہو چکا تھا۔ شگفتہ لہجے میں کہنے لگا۔

"بھئی سب باتیں اپنی جگہ ...... لیکن میں تو سالگرہ کے حق میں ہوں ...... وہ اس لئے کہ زندگی میں چند ہی دن تو ایسے ہوتے ہیں جنہیں یاد رکھا جا سکتا ہے۔ اب وہ دن جب انسان خود اس دنیا میں تشریف لائے ...... کوئی اتنا غیر اہم دن تو نہیں ہوتا کہ آدمی اسے بھول جائے ...... بالکل یاد ہی نہ رکھے۔ ہم تو اسی لئے اپنا جنم دن مناتے ہیں کہ یہ ہمیں یاد رہے۔"

"اور دوسروں کو بھی۔" تیمور نے فوراً لقمہ دیا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔" سلمان بولا۔

"واقعی کچھ دن تو زندگی میں اتنے اہم اور یادگار ہوتے ہیں کہ انہیں بھلایا نہیں جا سکتا...... مثال کے طور پر جس دن میں پہلی مرتبہ اسکول گیا وہ دن مجھے یاد ہے...... جس دن میں نے پانچویں جماعت میں فرسٹ پوزیشن لی تھی اور مجھے انعام ملا تھا...... وہ دن مجھے یاد ہے۔ جس دن اس نئے اسکول میں چھٹی میں داخلہ لیا تھا...... وہ دن بھی مجھے یاد ہے۔ میں نے سب دن ڈائری میں لکھ رکھے ہیں۔"

"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔" فواد نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میں نے تو پہلا ٹکٹ بھی سنبھال کر رکھا ہے جب میں نے بس میں سفر کیا تھا۔ اسی طرح ٹرین اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی ہیں میرے پاس۔ پہلی کلاس میں ملنے والا بستہ، پہلا پین، پہلی کتابیں اور کاپیاں، حتیٰ کہ وہ ریموٹ کنٹرول کھلونا موٹر سائیکل جو پاپا پہلی مرتبہ امریکہ سے میرے لئے لائے تھے...... میرے پاس بالکل صحیح حالت میں موجود ہے۔ بھئی ہم تو چیزوں کو سنبھال کر رکھنے کے عادی ہیں۔"

"یہ دنوں کے ذکر میں چیزیں کہاں سے گھس آئیں۔" تیمور بولا۔

"چیزوں کے ساتھ دن بھی یاد ہیں...... زبانی۔" فواد نے سینہ پھلا کر کہا۔ "اور صرف چیزوں کا ہی کیا ذکر...... میں نے تو وہ دن بھی نوٹ کر رکھے ہیں جب میری تم لوگوں سے پہلی ملاقات ہوئی تھی...... میرا تو خیال ہے کہ اب ہم ہر سال اپنی دوستی کی سالگرہ بھی منایا کریں گے۔"

"کافی نیک خیال ہے...... کیوں عادل؟" تیمور نے عادل کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور عادل خاموشی سے مسکرا دیا۔

—○—○—

فواد کی سالگرہ کے دو ہفتے بعد ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ سالگرہ کو ایک فضول رسم سمجھنے والے عادل نے سب دوستوں کو اپنی سالگرہ پر مدعو کیا۔ یہ خوشگوار حیرت کا مقام تھا۔ ان کا خیال تھا کہ فواد کی سالگرہ پر ہونے والی گفتگو نے پروفیسر عادل پر بہت اثر کیا ہے۔ بہرحال وہ اس تبدیلی پر خوش تھے۔ اور اپنی خوشی کے بھرپور اظہار کے لئے انہوں نے بہت خوبصورت اور قیمتی تحائف خریدے تھے۔

عادل کی سالگرہ جمعہ کے روز تھی۔ شام کے وقت وہ تینوں دوست عادل کے گھر پہنچے تو تھوڑے سے حیران تھے۔ کیونکہ انہیں اپنے علاوہ وہاں کوئی مہمان نظر نہیں آیا۔ انہوں نے عادل سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ انہیں بتایا کہ اس نے کسی اور کو بلایا ہی نہیں۔ عادل نے انہیں ڈرائنگ

چوراسی سال سے مسلسل روشن لیمپ

اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کی قبر پر تیرہ ستمبر ۱۹۰۸ء سے دن رات مسلسل مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا ہے۔ دانتے کے آبائی گاؤں فورنس کے رہنے والوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ قیامت تک یہ لیمپ روشن رکھیں گے اور اس کے اخراجات برداشت کریں گے۔

مرسلہ...... عبدالباسط ہری پور۔

روم میں بٹھایا۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد وہ لوگ ڈائننگ روم میں آ گئے۔ جہاں میز پر ایک بڑا سا کیک رکھا تھا۔ جس پر دو ڈھائی درجن موم بتیاں جل رہی تھیں۔ تیمور نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"عادل یہ تمہاری سالگرہ ہے یا تمہارے پاپا کی؟" اور عادل صرف مسکرا دیا تھا۔

موم بتیوں کی تعداد سے زیادہ جس چیز نے انہیں شدید حیرت میں ڈالا وہ کیک تھا۔ اس کی شکل مزار سے مشابہ تھی۔ ان لوگوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے آخر سلمان سے نہ رہا گیا۔ اس نے عادل سے پوچھ ہی لیا۔

"یہ کیا مذاق ہے عادل؟"

"یہ مذاق نہیں کیک ہے۔" عادل نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن یہ کیسا کیک ہے...... اور یہ موم بتیاں...... پوری تئیس؟"

عادل نے عادتاً مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوتے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر دھیرے سے بولا۔ "تم لوگ ہی تو کہتے ہو کہ کچھ دن انسان کی زندگی میں بہت اہم ہوتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے آج کا دن میرے لئے بہت اہم ہے...... اس لئے نہیں کہ آج کے دن میں پیدا ہوا تھا...... بلکہ اس لئے کہ آج کے دن پاکستان مر گیا تھا...... مشرقی پاکستان...... آج سولہ دسمبر ہے...... یوم سقوط ڈھاکہ...... کیوں فواد تمہیں تو یاد ہو گا تم تو اہم دنوں کو بہت یاد رکھتے ہو ناں؟"

"لیکن فواد کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا وہ سوچ رہا تھا۔

"ہم لوگ کتنے بے حس ہو گئے ہیں کتنے بے مقصد...... کتنے محدود...... ہمیں زندگی کی چھوٹی چھوٹی انفرادی خوشیاں یاد رہتی ہیں...... اور اتنے بڑے بڑے اجتماعی دکھ بھول جاتے ہیں۔"

وہ تینوں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ دسمبر کی سردی کے باوجود ان کے ماتھوں پر پسینہ چمک رہا تھا۔ شرمندگی کا پسینہ۔

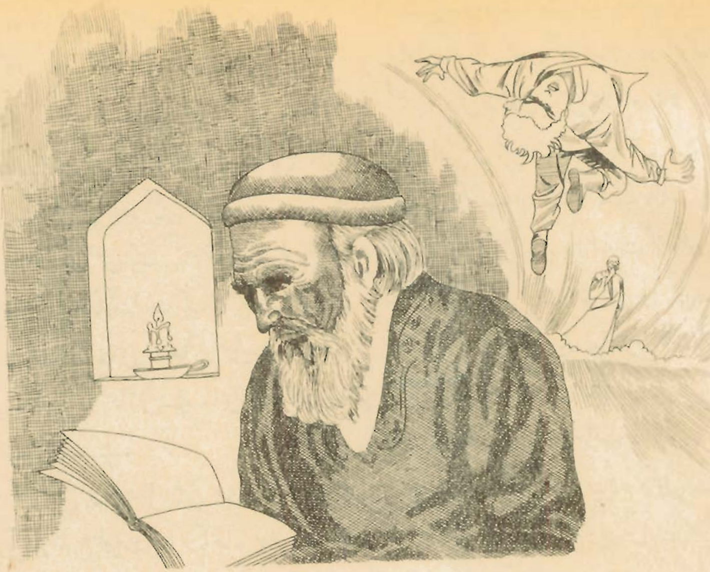

رحمان بابا — درویشِ خدامست

عابد سلطان

رحمان بابا کو پختو شاعری میں وہی مقام حاصل ہے جو سندھی زبان میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کو اور پنجابی زبان میں حضرت سلطان باہو کو حاصل ہے۔ رحمان بابا کی شاعری میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کیسے ہی فلسفیانہ نکتے یا شریعت اور طریقت کے کتنے ہی الجھے ہوئے اور مشکل مسائل کا بیان کیوں نہ ہو، بچے سے لے کر بوڑھے تک اور عالم فاضل سے لے کر ان پڑھ کسان تک، سب اس کے کلام کو سمجھتے اور سراہتے ہیں۔ یہاں تک کہ پختون گھرانوں کی ان پڑھ خواتین کو بھی رحمان بابا کا کلام زبانی یاد ہے اور وہ روز مرہ کی گفتگو میں یا چھوٹوں کو نصیحت کرتے وقت رحمان بابا کے اشعار برمحل استعمال کرتی ہیں۔

رحمان بابا کے فرمان کو سب پختون سچا اور مقدس سمجھتے ہیں اور اسے سند کے طور پر استعمال یہاں تک کہ اس علاقے میں رہنے والے ہندو، سکھ اور بدھ مت کے پیرو کار بھی آپ کا کلام پڑھتے اور پسند کرتے ہیں............اسی

مقبولیت کو دیکھ کر ر حمان بابا نے کہا تھا ع

چہ کافر تہ مہم انکار کوؤ لے تنشی
دا دی شعر دے ر حمان ، کہ اعجاز

(اے ر حمان، یہ تیرے اشعار ہیں یا کوئی معجزہ، جس سے کافر بھی انکار نہیں کر سکتے)

ر حمان بابا کا محض ایک عظیم شاعر کے طور پر ہی احترام نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ایک حق پرست اور بلند پایہ بزرگ اور مذہبی راہنما کی حیثیت سے بھی عقیدت اور احترام حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ روایت ہے۔

کہتے ہیں کہ نوجوانی میں عبدالر حمان بہت شرارتی اور شوخ طبیعت ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بڑوں اور بزرگوں سے بھی اکثر مذاق کرنے سے باز نہ آتا۔ ایک دن گاؤں سے باہر جنگل میں اکیلے شکار کھیل رہا تھا۔ یکایک اسے ایک سفید درویش ملنگ خدا کی حمد و ثنا گاتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ عبدالر حمان کو شرارت سوجھی اور اس بوڑھے ملنگ سے مسخرا پن کرنے لگا۔ یہ بوڑھا ملنگ دراصل ایک پہنچا ہوا صاحب کرامات بزرگ تھا۔ اسے جلال آ گیا اور عبدالر حمان کو ایک ہلکے پتے کی طرح اٹھا کر خلا میں آسمان کی جانب اچھال دیا۔ یہاں تک کہ وہ خلاؤں میں گم ہو گیا۔ پھر اسے واپس پلٹا دیا اور ایک ننھے بچے کی مانند بازوؤں میں سنبھال کر آرام سے زمین پر کھڑا کر دیا اور اسی طرح خدائے ذوالجلال کی حمد و ثنا گاتا ہوا جنگل میں کہیں غائب ہو گیا۔ خوف اور حیرت سے گنگ، عبدالر حمان اسے چپ چاپ ساکت کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ اسی لمحے نوجوان عبدالر حمان کو احساس ہو گیا کہ زندگی محض، خوش مذاقیوں، ہنسی مذاق اور شکار کھیلنے کا نام نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ تب سے ہر وقت شرارتیں کرنے اور قہقہے لگانے والا عبدالر حمان ایک خاموش طبع، سنجیدہ، عبادت گزار اور پرہیز گار جوان بن گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی نیکی، عبادت گزاری، پرہیز گاری، یاد خدا میں انہماک اور ذکر و تسبیح اس حد تک بڑھ گئی کہ لوگوں میں اس کی بزرگی اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا اور ر حمان بابا کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ نام لوگوں نے اس کی پرہیز گاری اور ذکر و تسبیح دیکھ کر اسے عقیدت اور احترام کے طور پر دیا۔

ابتدائی دنوں میں تو ر حمان بابا یاد خدا میں اس حد تک مستغرق ہوئے کہ لوگوں سے میل جول اور بات چیت بند کر دی تھی۔ ہر وقت یاد خدا میں مگن رہتے اور سارا دن اور اکثر راتوں کو بھی خدا کا ذکر، عبادات اور مراقبوں میں مشغول رہتے۔ رفتہ رفتہ یہ حالت اس حد تک بڑھ گئی کہ لوگوں کو ان پر دیوانگی کا شبہ ہوا۔ اب وہ اکثر گاؤں سے باہر ویرانوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں دن رات اور کھانے پینے سے بے نیاز یاد خدا میں محو رہتے۔ یہاں تک کہ پروفیسر عبدالمجید افغانی اور ایک انگریز منشرق اور محقق میجر راورٹی کے بیان کے مطابق ان کی یہ مجذوبانہ کیفیت اس حد تک بڑھ گئی کہ کھانے پینے کے ساتھ ساتھ اب ان کو نماز کا بھی دھیان نہ

رہا۔ ایک مسلسل مراقبہ اور استغراق کی کیفیت رہتی۔ اس حالت میں ان پر اشعار اترتے جو وہ ایک روایت کے مطابق زمین پر لکھ کر چھوڑ دیتے۔ جسے بعد میں ان کے عقیدت مند لکھ کر محفوظ کر لیتے۔ اکثر اوقات وہ زمین پر شعر لکھ کر بھول جاتے اور ضائع ہو جاتے۔ تب ان کی شاعری میں خدا سے عشق کا بیان بہت دلآویز طریقے پر ہوتا۔ وہ شعروں میں دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے اور مسلمانوں کو آخرت کے لئے نیک کام کرنے، مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانے اور ظلم سے بچنے کی نصیحتیں کیا کرتے۔ فرماتے ہیں۔

"دوسروں کی راہ میں گڑھے مت کھودو، کسی روز تمہارا بھی اسی راہ پر گزر نہ ہو"

رحمان بابا اگر پختو زبان کا مقبول ترین شاعر ہے اور اگر اس کا کلام بچوں اور بوڑھوں، لڑکوں اور لڑکیوں، جوانوں، بڑی بوڑھیوں، عالموں، اساتذہ، ان پڑھ کسانوں اور جاہل دھقانوں، غرض ہر کسی میں اتنا مقبول اور پسندیدہ ہے تو اس کا ایک سبب اس کے کلام کی سادگی، روانی اور موسیقیت بھی ہے۔ رحمان بابا کو نقادوں نے "پختو شاعری کا حافظ شیرازی" کہا ہے۔ نوجوان حجروں میں اس کا کلام ستار اور رباب کی موسیقی کے ساتھ گاتے ہیں اور خواتین گھروں میں گنگناتی ہیں۔ شاید ہی کسی شاعر کو اپنے کلام میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

رحمان بابا کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

"رحمان کو خدا ریاکاری کے لبادوں سے محفوظ رکھے۔ اس نے دستار کج باندھ رکھا ہے اور ایک خدامست قلندری ہے"

"اگر ایک اللہ تیرے ساتھ نہ ہو تو چاہے لشکر کے لشکر تیری حفاظت پر مامور ہوں، تو پھر بھی تنہا ہے"

"بند آنکھوں سے کس کو دیدار نصیب ہوا ہے؟ پس جسے خدا سے عشق ہو اسے نیند سے کیا کام؟"

"کعبہ کی بزرگی و پاکی میں کوئی شک نہیں لیکن ایک گدھا اس کے گرد کتنی ہی بار طواف کر لے، گدھا ہی رہے گا"

"یہ پھول جو آج دستار میں سجائے جا رہے ہیں، کل قدموں تلے خاک میں خاک ہو جائیں گے"

حیرت انگیز یادداشت

مغربی جرمنی کے ایک ڈاکٹر جان کیلر کی یادداشت حیرت انگیز طور پر بہت تیز تھی وہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ جب وہ کوئی چیز پڑھ لے تو وہ اسے کبھی نہیں بھولتا اسی طرح وہ جب کسی شخص سے ایک بار ملاقات کر لیتا تو پندرہ بیس سال بعد بھی اسے پہچان لیتا تھا حتیٰ کہ وہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ اس سے کس وقت کس جگہ اور کس تاریخ کو ملاقات کی تھی۔

مرسلہ...... عبدالباسط۔ ہری پور۔

وہ کیا دن تھے

عمارہ احمد

وہ کیا دن تھے عجب دنیا عجب باتیں تھیں اپنی
صبحیں روشن تھیں، دن تھے خوبصورت
سنہری جاگتی راتیں تھیں اپنی
ندھیری رات میں بستر پہ لیٹے
میں لگتا کہ بستر چل رہے ہیں
ھی بادل میں بلی اور کبھی تاروں میں جھولا سا
ظر آتا تھا ہم کو
ھی برسات کی شاموں میں ہم سب کشتیوں کی ریس کرواتے
ڑے پانی میں جب کاغذ کی ناؤ ڈوب جاتی
ہم سب دوست مل کر شور کرتے

جب اپنے دوستوں سے خوب لڑتے
تو اکثر ان سے کہتے، "اب نہیں بولیں گے تم سے"
مگر کچھ دیر میں "کُٹّی" ہماری ٹوٹ جاتی
کہ کیا کیجیے اچانک بس...... ہنسی سی چھوٹ جاتی
وہ کیا دن تھے عجب دنیا، عجب باتیں تھیں اپنی
کبھی جھاڑی کے پیچھے کوئی خرگوش
ہمیں حیران نگری کا کوئی جاسوس لگتا
اگر کھاتے کوئی ٹافی تو اکثر سوچتے یہ
کہ بس کچھ دیر میں بڑھ کر بڑے ہو جائیں گے اور
ہمیں گھر میں نہیں ڈانٹے گا کوئی
بہت سی تتلیاں بھنورے پکڑتے باغ میں ہم
مگر امی کی ڈانٹیں سن کے ان کو چھوڑ دیتے
کبھی باتیں شرارت کی بناتے چپکے چپکے
مگر بھیا کو آتے دیکھ کر سب بات کا رخ موڑ دیتے
اصل میں بات یہ ہے ہم بہت چالاک تھے تب
مگر یہ بات بھی ہے ہم بہت معصوم سے تھے
عجیب دنیا عجب باتیں تھیں اپنی
صبحیں روشن تھیں، دن تھے خوبصورت
سنہری جاگتی راتیں تھیں اپنی

مومن کا رومال

جسیب احمد

مومن نے اپنی امی سے کہا۔ "امی وہ مس نگہت کہہ رہی تھیں کہ میں ہر روز ایک صاف ستھرا رومال لے کر آؤں۔"

امی نے کہا۔ "میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ تمہیں پتہ ہے نا مومن کہ تمہارے رومال کہاں رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بس ہر روز ایک لے جایا کرو۔"

چنانچہ اگلی صبح مومن ایک صاف ستھرا رومال لے کر اسکول چل پڑا۔ وہ رومال لے کر اتنا خوش تھا کہ اسے ہاتھ ہی میں پکڑے جا رہا تھا۔ وہ اسے اسکول پہنچتے ہی مس کو دکھانا چاہتا تھا۔

لیکن راستے میں اسے ایک چھوٹی سی پہاڑی عبور کرنا تھی۔ اس نے پہاڑی پر سب سے اوپر اپنا رومال رکھا اور پھر خود چڑھا لیکن وہ اپنا رومال وہیں بھول گیا۔ جب وہ اسکول پہنچا تو مس نے پوچھا۔ "مومن تمہارا رومال کہاں ہے؟ کیا تم لائے

ہو۔"

مومن بولا۔ "جی ہاں مس۔" لیکن رومال اس کے ہاتھ میں تھا اور نہ اس کی جیب میں اور نہ اس کے بستے میں۔

"میرا خیال ہے کہ میں اسے اس پہاڑی پر ہی چھوڑ آیا ہوں۔" اسکول سے واپسی پر اس نے دیکھا کہ وہ رومال تو خاصا گندا اور پرانا ہو گیا تھا۔ ایک گائے نے اسے چبا ڈالا تھا اور اب وہ بے کار ہو گیا تھا۔

اگلی صبح مومن نے ایک اور رومال نکالا۔ اس نے سوچا کہ وہ اس میں ایک گرہ لگا لے گا تاکہ اسے اسکول لے جانا یاد رہے۔ چنانچہ اس نے رومال میں گرہ لگائی اور چل پڑا وہ پہاڑی پر سے اپنے رومال کے ساتھ بخیریت گزر گیا وہ خوشی خوشی جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک تتلی پر پڑ گئی وہ اسے پکڑنے بھاگ کھڑا ہوا قریب پہنچ کر مومن نے اپنا رومال زمین پر رکھا اور آہستگی سے اس پھول کی طرف بڑھا جس پر وہ تتلی بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر تتلی اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اڑ گئی۔ مومن تتلی پکڑنے کا خیال ذہن سے نکال کر اسکول کی طرف چل پڑا۔ وہ اپنا نیا رومال وہیں چھوڑ آیا تھا۔

"مومن تمہارا رومال کہاں ہے؟" مس نگہت نے پوچھا۔

"اس نے فخر سے جواب دیا۔ "مس آپ کو پتا ہے میں نے اس میں ایک گرہ باندھ دی تھی تاکہ اسے لانا یاد رہے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں؟" مس نے دریافت کیا۔ ظاہر ہے رومال ہوتا تو ملتا کیونکہ مومن تو اسے گھاس پر چھوڑ آیا تھا۔ مس نے ناراض لہجے میں کہا۔

"مومن تم ایک لاپروا لڑکے ہو گئے ہو۔ کل رومال یاد سے لانا۔"

اگلے دن مومن کو ایک اور رومال لے جانا پڑا کیونکہ دوسرے کو تو ہوا اڑا کر لے گئی تھی۔ "اس دفعہ میں اپنا رومال ضرور لے کر جاؤں گا اور اسے تمام راستے ہاتھ میں اٹھائے رکھوں گا تاکہ بھول نہ سکوں۔" مومن نے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن جیسے ہی وہ جانے کے لئے قدم بڑھانے لگا اس کی امی نے اسے ایک خط پوسٹ کرنے کو دے دیا۔ اس نے خط پکڑا اور بھاگتا ہوا چل پڑا۔ وہ چھ کا پہاڑا دہراتا گیا کیونکہ آج اسے یہ سنانا تھا۔ جیسے ہی وہ پوسٹ باکس تک پہنچا۔ اس نے بے خیالی میں خط کی جگہ اپنا رومال پوسٹ کر دیا اور جب وہ اسکول پہنچا تو اسے دیکھتے ہی مس نے پوچھا۔ "مجھے امید ہے کہ تم آج اپنا رومال یاد سے لائے ہو گے۔" مومن بولا۔ "جی ہاں مس یہ دیکھئے۔" اور انہیں خط پکڑا دیا۔ مس حیرت سے خط کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"لیکن یہ تو خط ہے رومال نہیں۔" مومن نے جواب دیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں نے اپنا رومال پوسٹ کر دیا۔"

مس نے جواب میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ

میں بہت جلد تم سے سخت ناراض ہوں گی۔ میں تمہیں ایک موقع اور دیتی ہوں۔ کل صبح یاد سے رومال لے آنا۔ "

اگلی صبح مومن نے ایک اور رومال نکالا۔ اس نے رومال کو جیب میں ڈال لیا تاکہ محفوظ رہے۔ وہ اسکول کی طرف چل پڑا مگر راستے میں کیچڑ میں پھسل کر گر گیا جس سے اس کے گھٹنے سے خون بہنے لگا اور کپڑے بھی لت پت ہو گئے۔ اس نے خون اور مٹی اپنے رومال سے صاف کئے۔ راستے میں ایک دیوار کے کونے پر رکھا ہوا پینٹ کا ڈبا اس کی قمیص پر گر گیا۔ یہ پینٹ بھی اس نے اپنے رومال ہی سے صاف کیا۔ رومال گندہ اور عجیب رنگ برنگا ہو چکا تھا لیکن وہ اس رومال کے ساتھ اسکول پہنچ گیا اور فخر سے مس نگہت کو دکھایا۔ مس غصے میں بولیں۔

"تم اس بدبودار، پینٹ گرے ہوئے چیتھڑے کو رومال کہتے ہو۔ میں نے تم سے ایک صاف ستھرا رومال لانے کو کہا تھا کل اگر تم رومال نہ لائے تو تمہاری پٹائی ہوگی۔" مومن نے گھر جاکر جب یہ بتایا تو اس کی امی سخت ناراض ہوئیں۔ انہوں نے اگلے روز ایک رومال دیتے ہوئے کہا۔

"مومن تم بہت ہی لاپروا اور غیر ذمہ دار ہو گئے ہو یہ تمہارے ابو کا رومال ہے کیونکہ تم اپنے سارے ہی رومال استعمال کر چکے ہو۔ آج بہت گرمی ہے میں اس رومال کی ٹوپی بنا کر تمہارے سر پر پہنا دوں گی تاکہ تم اسے بھول نہ سکو اور گرمی سے بھی محفوظ رہو۔"

مومن اس ٹوپی سے بہت خوش تھا۔ لیکن اسکول پہنچنے تک وہ یہ بھول گیا کہ وہ رومال ٹوپی کی شکل میں پہنے ہوئے ہے۔ جب مس نے اسے رومال دکھانے کو کہا تو اس کی جیبوں میں سے رومال نہ نکلا۔ مس نے کہا۔

"اب مجھے یہ مت بتانا کہ تم رومال لانا پھر بھول گئے ہو۔" مومن نے جواباً کہا۔

"مس مجھے یاد ہے کہ میں رومال لایا تھا اور مگر وہ پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے؟"

مس نے حکم دیا۔ "اپنی ٹوپی اتارو اور اندر آ کر مار کھاؤ۔"

جیسے ہی مومن نے ٹوپی اتاری اسے اپنا رومال مل گیا۔ اس نے مس نگہت سے کہا۔

"مس یہ دیکھیں رومال میں نے اسے سر پر اوڑھ رکھا تھا۔" مس بولیں۔

"تم بہت ہی بےوقوف بچے ہو۔ لیکن تم آج اپنے آپ کو مار سے بچا گئے ہو۔ مستقبل میں رومال اپنی قمیص کے ساتھ پن سے لگا کر آنا تاکہ تم اسے بھول نہ سکو۔ لاپرواہی اچھی عادت نہیں۔" مومن نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ واقعی ایک غیر ذمہ دار اور لاپروا لڑکا ہے۔ لیکن اس دن کے بعد سے مومن رومال لانا پھر کبھی نہیں بھولا۔ کیونکہ مس نگہت نے اسے رومال لانے کا صحیح طریقہ جو بتا دیا تھا۔

سفر نامہ

مینگورہ سے وادیٔ اوشو تک

نیاز احمد خان

اس دن اسکول میں صبح سے ہی خاصی گہما گہمی تھی کیونکہ آج اسکول کے اسکاؤٹ گروپ کا دورہ تھا۔ یہ اسکاؤٹ مختلف کلاسوں سے چنے گئے تھے۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ اسکاؤٹ گروپ کا یہ دورہ کالام تک کا ہے لہٰذا وہ اپنے ساتھ مختصر سامان لائیں۔

صبح ساڑھے سات بجے معمول کے مطابق اسمبلی ہوئی۔ ٹھیک نو بجے بس پہنچ گئی تمام طلبا نے اپنے سامان بس کی چھت پر رکھ دیئے۔ اس طرح پچاس طلبا اور دس اساتذہ کا یہ قافلہ تقریباً دس بجے اسکول سے گبرال کی طرف روانہ ہوا۔ جی ہاں گبرال مشرق کے سوئٹزر لینڈ سوات کا ایک خوبصورت اور دل کش علاقہ ہے۔

بس جوں ہی مینگورہ شہر سے باہر نکلی۔ سب طلبا نے خوشی کا نعرہ لگایا کیونکہ بس اب خوبصورت دریائے سوات کے کنارے کنارے سفر کر رہی تھی اور مہکتی ہوئی ہوا دل و دماغ کو فرحت اور مسرت کا احساس بخش رہی تھی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد بس کے طلبا دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک دوسرے پر نعرہ بازی کرنے لگے۔

سب سے زیادہ جو نعرہ مشہور ہوا وہ تھا "شیو شیو ...... کلین شیو۔" دراصل اسکول کے ایک طالب علم نے کلین شیو کیا ہوا تھا جس سے اس کی شکل کافی مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔

بس خوازہ خیلہ پہنچی تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ خوازہ خیلہ سوات کا وہ مشہور قصبہ ہے، جہاں سے پکی سڑک مشرق کی طرف شانگلہ پار اور شاہراہِ ریشم کی طرف مڑ گئی ہے۔ اور دوسری سڑک مدین بحرین کی جانب چلی گئی ہے۔

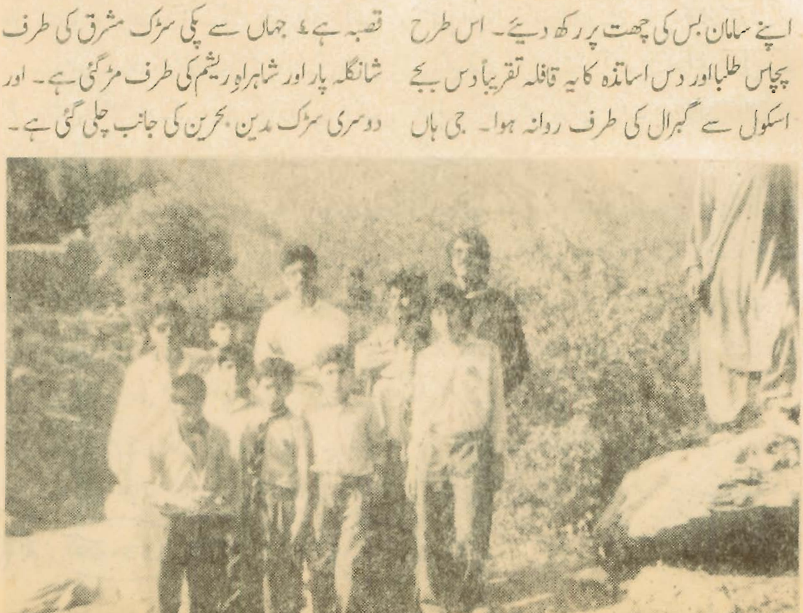

سب طلبا اپنے ساتھ لنچ بکسوں میں طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزیں لائے تھے۔ بعض طلبا نے گرم گرم روٹیاں اور کباب خریدے۔ بھوک خوب چمک اٹھی تھی۔ سب طلبا نے پہاڑوں میں گھرے ہوئے خواز خیلہ کے خوب صورت قصبے میں کھانے سے نہ صرف بھوک مٹائی بلکہ خوب لطف اندوز بھی ہوئے۔

کھانے کے بعد بس ایک مرتبہ پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ سوات کے خوب صورت اور دل فریب علاقے ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ اور ہم قدرت کے حسین منظر سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ایک گھنٹہ کے بعد ہم سوات کی حسین وادی مدین سے گزرے۔ مدین کے قریب ایک دلکش مقام چیل ہے۔ جس میں ٹراؤٹ مچھلیوں کا ایک فارم ہے۔ ٹراوٹ مچھلی دریائے سوات میں پائی جاتی ہے۔ جو لذت اور ذائقے میں اپنی مثال آپ ہے۔ مدین کے بعد ہم سوات کی گل و لالہ کی وادی بحرین میں داخل ہوئے۔ یہاں کی رونق، خوب صورتی اور دل آویزی دیکھ کر کچھ طلبا نے شور مچایا کہ یہاں کچھ دیر کے لئے ٹھہرا جائے۔ لیکن ہماری منزل ابھی کافی دور تھی اور ہم دن کی روشنی میں وادیٔ کالام میں داخل ہونا چاہتے تھے اس لئے وقت کی کمی کے باعث اساتذہ کرام نے یہاں رکے بغیر آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ طلبا نے بھی اساتذہ کے فیصلے کے احترام میں خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن قدرت کو شاید طلبا کی سعادت مندی بہت پسند آئی

اس لئے جوں ہی ہم بحرین بازار سے باہر نکلے اچانک بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اس لئے مجبوراً بس کو روکنا پڑا اور اس طرح طلبا کو سیر کا موقع مل گیا۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام طلبا بس سے اتر گئے۔ ادھر بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر ٹائر تبدیل کرنے میں مصروف ہوئے اور ادھر بہت سے طلباء نے "بھنگڑا" ڈال دیا۔ اس طرح تالیاں بجا اور گا کر وقت کو ماضی کے یادگار لمحوں میں تبدیل کیا گیا۔

بحرین سوات کا بہت خوب صورت مقام ہے۔ یہ چاروں طرف سے فلک بوس پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہاں بہت سے خوب صورت ہوٹل ہیں۔ بارونق بازار ہیں۔ اور سیاحتی سہولتوں کے لحاظ سے یہ وادی مالا مال ہے۔ بحرین میں درال ندی اور دریائے سوات کا ملاپ یہاں کا سب سے حسین اور دل آویز نظارہ ہے۔ بس کا ٹائر تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ہم ایک بار پھر اپنی منزل کے طرف حسین اور پر پیچ سڑک پر رواں دواں ہو گئے۔

بس کے ایک طرف برف پوش پہاڑوں کا طویل سلسلہ تھا اور دوسری طرف دریائے سوات ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ان دنوں پاکستان کے دیگر علاقہ میں موسم شدید گرم تھا۔ لیکن یہاں موسم بے حد خوش گوار تھا۔

کالام سے کچھ فاصلے پر بس روکی گئی۔ تمام طلباء کی گنتی کی گئی اور ان کو ٹور نمبر دیئے گئے تاکہ

بعد میں آسانی کے ساتھ ہر طالب علم کی حاضری لی جاسکے۔

بس ایک مرتبہ پھر روانہ ہوئی۔ آخر کار ہم سوات کی سب حسین اور دل کش وادی کالام پہنچ گئے۔ کالام کی وادی کے متعلق ایک شاعر کا کہنا ہے۔

جام تک آئے مئے گُل فام تک آئے نہیں
جو سوات آئے مگر کالام تک آئے نہیں

سوات کی یہ کشادہ وادی چاروں جانب سے فلک بوس اور برف پوش چوٹیوں میں گھری ہوئی ہے۔ یہاں کا مشہور پہاڑ فلک سیر ہے۔ جو واقعی اسم با مسمیٰ ہے۔ اس کے اوپر پہنچ کر واقعی آسمان کی سیر کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ آسمان پر چھائے بادلوں کے سفید ٹکڑے اور اس کا سبز رنگ حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ فلک سیر کے دامن میں کئی خوب صورت ہوٹل ہیں اور یہاں سے زیریں کالام کا نظارا بہت حسین اور لطف پرور محسوس ہوتا ہے۔

کالام کی وادی سوات کی دیگر وادیوں سے خوبصورتی کے لحاظ سے بہت منفرد ہے۔ یہاں قدرت کی تمام رعنائیاں جمع ہو گئی ہیں۔ گنگناتے آبشار، ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریائے سوات، مختلف چھوٹی ندیاں، گھنے جنگلات، برف پوش چوٹیاں اور پھلوں سے لدے درخت یہ زمین کی جنت کا ایک حسین نمونہ ہے۔ فیصلہ کیا گیا کہ رات کالام میں گزاری جائے اور صبح سویرے گبرال کی جانب کوچ کیا جائے۔

بس کالام ہائی اسکول کے سامنے رک گئی اور تمام طلبا اپنے اپنے سامان اسکول میں رکھنے لگے۔ اس کے بعد طلبا کو گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ان کو کالام کی سیر کی اجازت دی گئی۔ تمام طلبا نے کالام کی خوبصورت اور حسین مقامات کی خوب سیر کی اور رات کے آٹھ بجے واپس آکر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اسکاؤٹ لیڈر شیر محمد صاحب نے تمام طلبا کو ایک دائرے کی شکل میں بٹھا دیا اور باقاعدہ اسکاؤٹ قانون کے مطابق کیمپ فائر کا اعلان کیا۔ کیمپ فائر کی دعوت اکیڈمی کے ایڈ منسٹریٹر خورشید احمد خان صاحب کو دی گئی۔ انہوں نے ماچس کی تیلی جلا کر اس مجلس کا افتتاح کیا۔

سب سے پہلے شیر محمد صاحب نے لطیفے اور کچھ دیگر آئٹم پیش کر کے مجلس کو زعفران زار کر دیا۔ پھر باری باری تمام طلبا اور اساتذہ نے لطیفے، نظمیں، ملی نغمے اور واقعات سنائے۔ سب سے زیادہ جو نظم پسند کی گئی وہ تھی۔ "چاند، تاروں میں تو، مرغزاروں میں تو اے خدایا۔" اس نظم نے ماحول پر سحر طاری کر دیا۔ رات دو بجے تک یہ خوبصورت محفل گرم رہی۔ پھر سب سونے کیلئے چلے گئے۔ رات کو انتہائی سردی تھی بعض طلبا نے سردی کی وجہ سے نیند پوری بھی نہیں کی۔ صبح سویرے تمام طلبا اٹھے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوئے تو ڈرائیور نے "خوشخبری" سنائی کہ گاڑی میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے زیادہ فاصلہ طے

کرنے سے قاصر ہے۔ کالام سے گبرال کا فاصلہ تقریباً ۱۶ کلو میٹر ہے۔ راستہ کافی خراب تھا۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ خطرہ مول لئے بغیر گبرال کی بجائے اوشو جانا بہتر رہے گا۔ اوشو کالام سے تقریباً آٹھ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ جو سوات کا ایک بہت معطر اور دل کش مقام ہے۔ بس اوشو کی پکی سڑک پر روانہ ہوئی۔

جب بس سڑک پر جارہی تھی تو سامنے پہاڑی پر خوبصورت آبشار دیکھنے کو ملے جن کا دودھ کی طرح سفید پانی کسی جادوئی منظر کی طرح پہاڑوں کے اوپر سے نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ اوشو کے پہاڑوں پر گھنے جنگلات اور وادی کے عین درمیان میں بہتا ہوا خوبصورت دریا دیکھ کر اوشو خواب و خیال کی وادی لگ رہی تھی۔ قدرت کے یہ حسین اور دل کش مناظر دیکھ کر انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ ساری عمر یہاں رہے۔ بس اوشو پہنچ گئی تو وہاں دریا کے کنارے ڈیرہ ڈال دیا گیا۔ ایک طرف باورچی صاحب نے اپنا کام شروع کیا۔ سرحاجی فضل رحمان کی قیادت میں طلبا نے اتنی لکڑیاں جمع کیں کہ اس کو جلانا مسئلہ بن گیا وہاں لکڑی وافر تعداد میں موجود تھی اور جگہ جگہ بڑے بڑے شہتیروں کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔ یہ لکڑیاں سوات کے جنگلات سے کاٹ کر اکٹھی کی گئی تھیں۔ جنہیں بعد میں حکومت ٹرکوں میں بھر کر ملک کے دوسرے حصوں میں بھجوانے کا بندوبست کرتی ہے۔ اوشو میں رہائش کے زیادہ تر مکانات لکڑیوں سے بنوائے گئے ہیں جن کے دروازوں اور کھڑکیوں پر مقامی کاریگروں نے انتہائی نفیس اور خوبصورت کندہ کاری کی ہے۔ یہ مکانات بہت خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ جاپان کا کوئی حسین اور دل کش قصبہ ہو۔ دریا کا پانی بہت سرد تھا اور موسم میں کافی خنکی تھی۔ دھوپ خوب نکھری ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ پاکستان کے اکثر علاقوں میں لوگ گرمی سے بے حال تھے اور وادیٔ سوات میں سردی اپنے عروج پر تھی۔ قدرت نے پاکستان کو ہر قسم کے موسم عطا کئے ہیں۔ سوات میں زمرد کی کان اور اس کے پہاڑوں میں قدرتی معدنیات کے علاوہ اسے معتدل آب و ہوا سے بھی نوازا ہے۔ اس حسین سفر کے اختتام پر جب ہم لوگ واپس مینگورہ روانہ ہوئے تو راستے میں شدید بارش نے آ لیا لیکن بس بغیر رکے چلتی رہی۔ اب بھی ہم سب دوست فرصت میں جمع ہوتے ہیں تو اس سفر کی دلچسپ یاد سے اپنا دل بہلاتے ہیں...... ایسی ہی ایک محفل میں ایک دوست نے کہا۔

"بھئی میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ پاکستان کیسا خوبصورت ملک ہے لیکن جسے دیکھو اسے پاکستان سے شکایت ہے۔"

اس پر ایک دوسرے دوست نے جواب دیا۔ "کاش کوئی پاکستان سے بھی پوچھ لے کہ اسے ہم لوگوں سے کیا کیا شکایتیں ہیں؟"

جان کا بیوپاری سر پھرا کھلاڑی

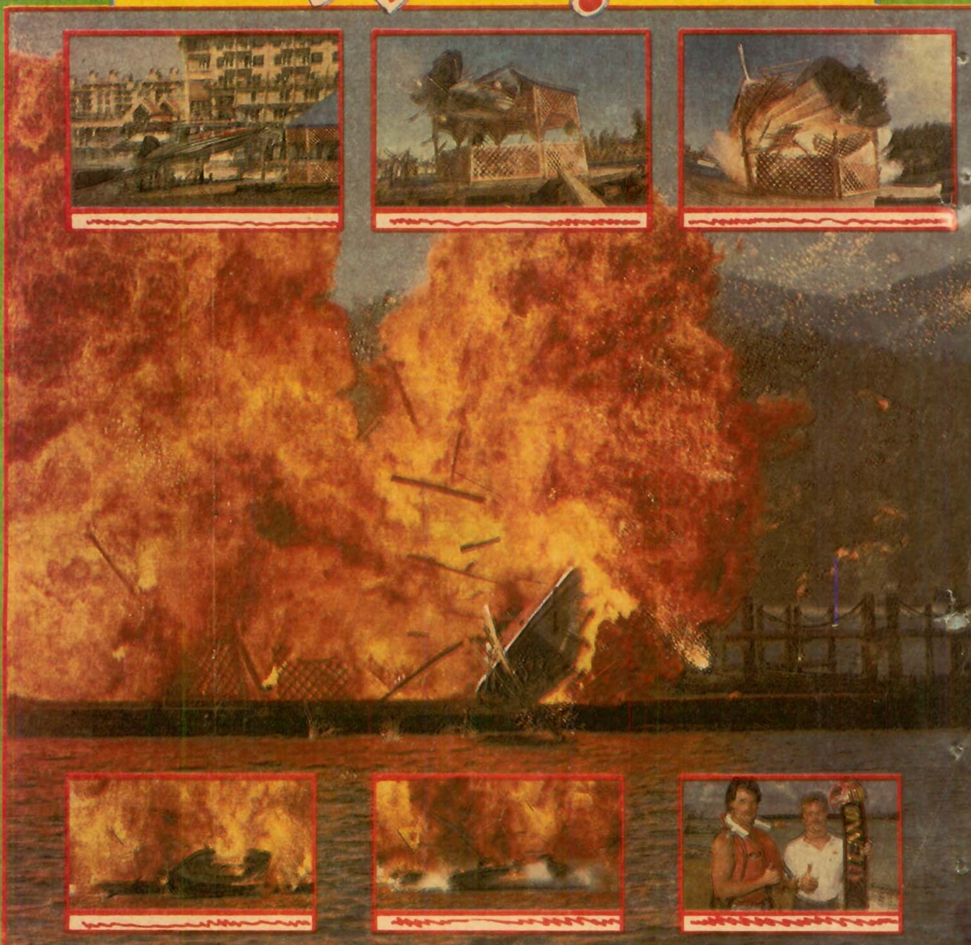

جھیل کی پرسکون سطح پر رنگ برنگی کشتیاں تیرتی نظر آرہی ہیں۔یوں ... جیسے بہت سی مرغابیاں اور بگلے پانی کی سطح پر اتر آئے ہوں۔ بڑا پُرلطف منظر ہے۔ اچانک ایک طرف سے زوں زوں کی پرشور آواز آتی ہے۔ایک کشتی بہت تیز رفتاری سے دیگر کشتیوں سے الگ ہوتی ہوئی جھیل میں بنے ایک چھوٹے سے مینار کی طرف بڑھتی ہے ...... راستے میں کسی شے سے ٹکرا کر زور سے اچھلتی ہے اور پوری قوت سے اُس مینار کی چھت سے ٹکرا جاتی ہے۔زور دار دھماکہ ہوتا ہے اور زبردست آگ کے شعلے آسمان کی طرف لپکنے لگتے ہیں دیکھنے والوں کا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر رہ جاتا ہے ..... وہ سوچتے ہیں ... نہ جانے کشتی اور کشتی چلانے والے کا کیا حشر ہوا ہوگا، پتا نہیں وہ اس حادثے سے بچا بھی ہوگا یا نہیں؟ لیکن یہ حادثہ ... حادثہ ہے ہی کہاں .... یہ تو ایک کرتب ہے۔جو اسٹنٹ مین مِکی گائیکو مازی نے دکھایا ہے۔یہ کرتب دکھانے کے بعد وہ حفاظت سے دوسری طرف جھیل میں اتر جاتا ہے۔آپ تصویر میں اس بے خوف کھلاڑی کو انگوٹھے سے کامیابی کا نشان بناتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔مکی کے ہنر کے علاوہ اس کرتب میں استعمال ہونے والی کشتی بھی خاص طور پر اسی مقصد کے لئے بنائی گئی ہے۔یہ فائر پروف کشتی ہے۔یہ سین جو آپ دیکھ رہے ہیں ٹی وی کی ایک ایکشن مووی کے لئے فلمایا گیا۔

رانگ نمبر

عباس عالم

میں اپنے دوست کو فون کرنے کے لئے نمبر ملا چکا تھا اور دوسری جانب گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر دوسری طرف سے ریسیور اٹھایا گیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا آواز آئی۔ "رانگ نمبر" اور فون رکھ دیا گیا۔

میں پریشان سا ہو گیا۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا۔ پھر گھنٹی سنائی دی۔ ریسور اٹھایا گیا۔ لیکن پھر وہی خشک لہجہ۔ "رانگ نمبر" اور رابطہ ختم۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے سوچا اور ہلکے ہلکے دوبارہ نمبر ملایا۔ سوچ سوچ کر میں سمجھ چکا تھا کہ کسی خرابی کی وجہ سے اس وقت بار بار یہی نمبر ملے گا۔

فون پھر اٹھایا گیا۔ "رانگ نمبر" ذرا سخت لہجے میں آواز آئی۔

"ایک منٹ رکئے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" اسی لہجے میں پوچھا گیا۔

"وہ ایک بات پوچھنی ہے۔" میں نے کہا۔ اب تک میں سمجھ چکا تھا کہ آواز میرے ہی کسی ہم عمر لڑکے کی ہے۔

"ہاں پوچھئے۔" آواز آئی۔ "وہ یہ کہ بغیر آواز سنے ہی کیسے معلوم ہو گیا کہ نمبر غلط ہے؟" میں نے پوچھا۔ دوسری طرف ذرا خاموشی رہی۔

"اندازہ غلط تو نہیں تھا نا؟" پھر آواز آئی۔

"ہاں!" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن معلوم کیسے ہوا؟"

"غور کیجئے۔" آواز آئی۔ "خود ہی سمجھ جائیں گے۔" اور پھر ریسور رکھ دیا گیا۔ میرے ہاتھ میں ریسور تھوڑی دیر جھولتا رہا پھر صورت حال مجھے کچھ کچھ سمجھ میں آئی۔

"اچھا۔" میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ "آپ نے پھر فون کر دیا۔" شکایتی لہجے میں کہا گیا۔

"جی ہاں! میں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے اندازہ کر لیا کہ آپ کو رانگ نمبر کا علم کیسے ہو جاتا ہے۔"

"اچھا!" دوسری جانب سے آواز آئی۔ "بتایئے؟"

"وہ کیا بات یہ ہے کہ آپ کو کبھی کوئی فون ہی نہیں کرتا ہوگا نا اس لئے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ سمجھ گئے۔" دوسری طرف سے مایوسی سے کہا گیا۔ "اب میں فون رکھ دوں۔"

"نہیں ایک منٹ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب آپ فون نہیں رکھ سکتے۔"

"کیوں!" حیرانی سے پوچھا گیا۔ "اس لئے کہ اب میں نے خاص طور پر آپ ہی کو فون کیا ہے اور اب یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔"

"اچھا!" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "پھر بات کیجئے۔"

"بات" میں نے سر کھجایا۔ "یہ بتایئے آپ کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں۔"

"میں پڑھتا نہیں ہوں۔" جواب آیا۔

"اچھا آپ نے آج موسم دیکھا کیسا ہو رہا ہے لگتا ہے بہت تیز بارش ہوگی۔ ان بارشوں نے تو آنا جانا بھی مشکل کر دیا ہے۔" میں کہہ کر ذرا رکا۔ تاکہ کچھ جواب ملے۔

"پتا نہیں۔" آواز آئی۔ "میں کہیں نہیں آتا جاتا۔ اور اب میں فون رکھ رہا ہوں۔"

"ایک منٹ۔ میرا نمبر لکھ لیجئے۔" میں نے کہا۔ "شاید آپ کو فون کرنا پڑے۔"

"کیوں؟" سوال کیا گیا۔

"یونہی جب دل چاہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" اس دفعہ لہجہ پھر سخت ہو گیا تھا۔

"دیکھئے جس طرح کچھ لوگ "قلمی دوست" ہوتے ہیں، اسی طرح ہم ٹیلی فونی دوست بن سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ٹیلی فونی دوست ...... کتنے مزے کی بات ہے۔" وہ ہنس دیا اور میں بھی ہنسی میں شریک ہو

گیا۔

یوں ہم ٹیلی فونی دوست بن گئے۔

رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ میرے دوست کا نام سجاد ہے اور وہ بہت اداس اور اکیلا رہتا ہے کیونکہ ایک ٹریفک حادثے میں اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ معذور ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر میں کسی رشتے کی خالہ کے ساتھ رہتا تھا جنہیں اس کا زیادہ خیال نہیں تھا۔ اس کا اسکول بھی چھُوٹ گیا تھا اور دوست بھی۔ لیکن وہ بہت اچھا لڑکا تھا...... بہت پیارا نرم دل اور حساس۔ مختلف موضوعات پر اس کا مطالعہ بہت اچھا تھا اسے ہر بات جیسے پہلے سے معلوم ہوتی ہیں اپنے مختلف مسائل پر اس کا مشورہ لیا کرتا پھر میں نے اس کے گھر کا پتا بھی معلوم کر لیا۔ لیکن کبھی گیا نہیں۔ معلوم نہیں وہ کیا محسوس کرے۔ میں سوچ کر رہ جاتا۔

ایک دن ہم یونہی فون پر بات کر رہے تھے اچانک سجاد نے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے پرسوں میری سالگرہ ہے۔“

”ارے واہ!“ میں نے خوشی سے کہا ”مبارک ہو!“

”کیا مبارک ہو؟“ وہ اداس ہو گیا۔ ”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہوتا جو مبارک باد ہی دے دے۔“

”اچھا!“ میں نے فوراً ایک فیصلہ کر لیا اور ذرا دیر بات کر کے فون رکھ دیا۔

اس کی سالگرہ کے دن میں نے بڑا سا کیک خریدا۔ تحائف لئے اور شام کو اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ خوبصورت سا گھر تھا لیکن ویران ویران سا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ دوبارہ...... تیسری بار۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے سوچا۔ سامنے چند لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔

”کس کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں؟“ ایک نے مجھے پریشان دیکھ کر پوچھا۔

”یہاں سجاد ہوتا ہے۔“ میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ”اوہ!“ سب لڑکے چپ سے ہو گئے۔

”کیا ہوا؟“ میں ذرا پریشان سا ہو گیا۔ ”اصل میں سجاد کا کل ٹریفک حادثے میں انتقال ہو گیا۔“ ایک لڑکے نے ذرا افسردہ لہجے میں کہا۔ وہ بہت عرصے بعد گھر سے باہر نکلا تھا۔ نہ جانے کہاں جانے کے لئے۔ ”لیکن سڑک پار کرتے ہوئے......“ لڑکا رک گیا۔ پھر کہا۔ ”معذور تھا ناں!“

مجھے چکر سا آ گیا۔ کوئی جواب دیئے بغیر میں واپسی کے راستے پر ہو لیا۔ موم بتیاں کیک کے بجائے میری آنکھوں میں جلنے لگی تھیں۔

اس واقعے کو زمانہ ہو گیا۔ لیکن آج بھی جب میں کوئی فون نمبر ملانے لگتا ہوں تو دل چاہتا ہے دوسری جانب سے کوئی فون اٹھائے اور تلخ لہجے میں کہے۔ ”سوری رانگ نمبر!“

(ماخوذ)

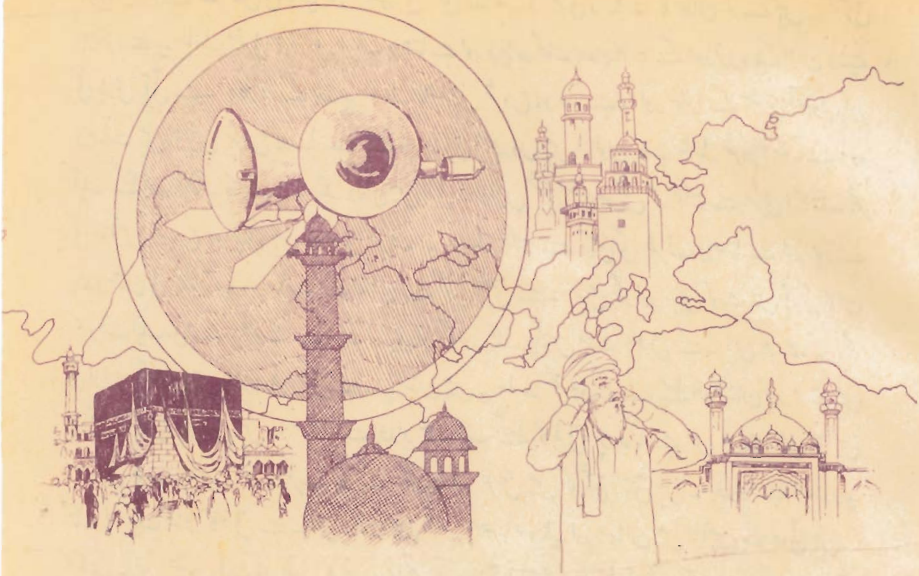

اللہ اکبر

عبدالباسط

دنیا میں ہر وقت گونجنے والی آواز

دنیا میں ہر وقت گونجنے والی صدا اذان ہے۔ اگر دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اسلامی ممالک میں انڈونیشیا کرۂ ارض کے عین مشرق میں واقع ہے۔ یہ ملک ہزاروں جزیروں پر مشتمل ہے جن میں جاوا، سماٹرا، بورنیو سیبلز بڑے جزیرے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے انڈونیشیا گنجان آباد ہے اور اس کی آبادی اٹھارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ طلوع سحر سیبلز کے مشرق میں واقع جزائر میں ہوتی ہے۔ طلوع سحر کے ساتھ ہی انڈونیشیا کے انتہائی مشرقی جزائر میں فجر کی اذان شروع ہو جاتی ہے اور بیک وقت

ہزاروں مؤذن اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان کرتے ہیں۔ مشرقی جزائر سے یہ سلسلہ مغربی جزائر کی طرف بڑھتا ہے اور ڈیڑھ گھنٹہ بعد جکارتہ کے موذنوں کے اذان دینے کی باری آتی ہے۔ جکارتہ کے بعد یہ سلسلہ سماٹرا میں شروع ہو جاتا ہے۔ اور سماٹرا کے مغربی قصبوں اور دیہات میں اذانیں شروع ہونے سے پہلے ہی ملایا کی مسجدوں میں اذانوں کا یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہ ایک گھنٹے بعد ڈھاکہ پہنچتا ہے۔ بنگلہ دیش میں ابھی یہ اذانیں ختم نہیں ہوتیں کہ کلکتہ سے سری لنکا تک فجر کی اذانیں شروع ہو جاتی ہیں دوسری طرف یہ سلسلہ کلکتہ سے بمبئی کی طرف بڑھتا ہے اور پورے ہندوستان کی فضا توحید و رسالت کے اعلان سے گونج اٹھتی ہے۔ سری نگر اور سیال کوٹ میں فجر کی اذان کا وقت ایک ہی ہے سیالکوٹ سے کوئٹہ کراچی اور گوادر تک چالیس منٹ کا فرق ہے۔ اس عرصے میں فجر کی اذان پاکستان میں بلند ہوتی رہتی ہے۔ پاکستان میں یہ سلسلہ ختم ہونے سے پہلے افغانستان اور مسقط میں اذانیں شروع ہو جاتی ہیں۔ مسقط سے بغداد تک ایک گھنٹے کا فرق پڑ جاتا ہے اس عرصے میں اذانیں سعودی عرب، یمن، متحدہ عرب امارات، کویت اور عراق میں گونجتی رہتی ہیں۔ بغداد سے اسکندریہ تک پھر ایک گھنٹہ کا فرق ہے۔ اس وقت میں شام، مصر، صومالیہ اور سوڈان میں اذانیں بلند ہوتی ہیں۔ اسکندریہ اور استنبول ایک ہی طول عرض پر واقع ہے۔ مشرقی ترکی سے مغربی ترکی تک ڈیڑھ گھنٹہ کا فرق ہے۔ اس دوران ترکی میں اذانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسکندریہ سے طرابلس تک ایک گھنٹہ کا فرق ہے۔ اس عرصہ میں شمالی افریقہ میں لیبیا اور تیونس میں اذانوں کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ فجر کی اذان جس کا آغاز انڈونیشیا کے مشرقی جزائر سے ہوتا ہے ساڑھے نو گھنٹے کا سفر طے کر کے بحراوقیانوس کے مشرقی کنارے تک پہنچتی ہے۔ فجر کی اذان بحراوقیانوس تک پہنچنے سے پہلے ہی مشرقی انڈونیشیا میں ظہر کی اذان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ڈھاکہ میں ظہر کی اذانیں شروع ہو جانے تک مشرقی انڈونیشیا میں عصر کی اذانیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ یہ سلسلہ ڈیڑھ گھنٹہ تک بمشکل جکارتہ تک پہنچتا ہے کہ مشرقی جزائر میں مغرب کی اذان کا وقت ہو جاتا ہے مغرب کی اذانیں سیلبز سے ابھی سماٹرا تک ہی پہنچتی ہیں کہ اتنے میں انڈونیشا کے مشرقی جزائر میں عشا کی اذانیں گونج رہی ہوتی ہیں۔ کرۂ ارض پر ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرتا جب ہزاروں سینکڑوں موذن اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ کر رہے ہوں۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

بے بس مسیحا

فاروق حسن چانڈیہ

غلام اللہ جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی زبان بھی مفلوج ہو گئی تھی۔ البتہ سوچ سکتا تھا۔ کئی دنوں سے وہ بستر پر پڑا اپنی بے بسی پر سوچ سوچ کر آنسو بہائے جا رہا تھا۔ اگر اس کی زبان ساتھ دیتی تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا تھا۔

غلام اللہ کی پیدائش کے دس دن بعد ہی اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اب اس کے اور اس کی والدہ کے اخراجات رشتہ داروں کی امداد سے بہت مشکل سے پورے ہوتے تھے۔ ان حالات کے باوجود بھی اس کی والدہ آمنہ بی بی اسے تعلیم دلانے کا پکا ارادہ رکھتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے غلام اللہ کو پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کرا دیا۔ اور خود گاؤں کے حکیم سیف اللہ کے گھر میں تھوڑی سی تنخواہ پر نوکری کر لی، تاکہ بیٹے کی پڑھائی کا بوجھ اٹھا سکیں۔ وقت تیز رفتاری کے ساتھ

گزرتا رہا اور غلام اللہ نے پرائمری تعلیم حاصل کر لی مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن اچانک آمنہ بی بی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی اور وہ انتقال کر گئیں۔ اب غلام اللہ کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا نہ تھا۔ حکیم سیف اللہ نے ترس کھا کر اسے اوپری کاموں کے لئے دوا خانے میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی اسے حکمت بھی سکھانے لگے۔ غلام اللہ کو اللہ نے اچھا دماغ دیا تھا۔ اس کے بل بوتے پر وہ تیزی سے حکمت کا ہنر سیکھتا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے طور پر نئی دوائیاں بنانے کے لئے جڑی بوٹیوں پر تجربات بھی کرتا رہتا تھا۔ وہ جب بڑا ہوا تو حکیم سیف اللہ نے اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی اور دوسرے قصبے میں اپنا الگ دواخانہ کھولنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس کا دواخانہ کچھ ہی دنوں بعد بہت اچھا چلنے لگا۔ لہٰذا اس نے مدد کے لئے شاگرد بھی رکھ لئے۔ ایک زبردست کامیابی اس نے یہ حاصل کر لی کہ عام سی جڑی بوٹیوں کی مدد سے فالج کی دوائی بنالی۔ اس دوا کی مانگ بہت زیادہ تھی اور پھر اس نے اس کی قیمت بھی زیادہ رکھی تھی۔ اس لئے ...... اسے صرف اس دوا سے ہی بہت زیادہ آمدنی ہونے لگی۔ غلام اللہ نے اس دوائی کو بنانے کا ہنر اپنے شاگردوں سے چھپا رکھا تھا یہاں تک کہ وہ فالج کی دوائی بنا کر بھی نہیں رکھتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی تھی تو اکیلے میں جا کر ایک خوراک بنا کر مریض کو کھلا دیتا تھا۔ یوں لگاتار تین دن ایک ایک خوراک بنا کر جس مریض کو کھلاتا وہ اللہ کی مہربانی سے اچھا ہو جاتا تھا۔

ایک دور کے قصبے کے چوہدری دین محمد پر فالج کا شدید حملہ ہو گیا۔ وہ ایک مہینے تک بستر پر پڑے رہے۔ کئی ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج کروایا مگر فائدہ نہیں ہوا۔ ایک دن ایک بھیک مانگنے والے فقیر نے چوہدری کے بیٹے کو بتایا کہ صحرا کے پار پچیس میل کے فاصلے پر ایک قصبہ بادل پور ہے جہاں حکیم غلام اللہ رہتے ہیں۔ وہ شدید فالج کے مریض کو بھی تین دن کے علاج سے ٹھیک کر دیتے ہیں۔

چوہدری کے بیٹے نے مزید معلومات کیں اور پھر غلام اللہ کا پتا اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر قصبہ بادل پور روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے تھکن اتارے بغیر حکیم غلام اللہ سے مل کر اپنے والد کے علاج کے لئے گزارش کی جسے حکیم غلام اللہ نے بہت بڑے معاوضے کے عوض قبول کر لیا۔ چوہدری کے بیٹے کا گھوڑا بہت ہی تندرست اور اچھا تھا اس لئے اپنی اور گھوڑے کی تھکن اتارے بغیر اسی وقت حکیم کو لے کر واپس اپنے گاؤں چل پڑا۔ حکیم غلام اللہ نے بھی اپنا گھوڑا ساتھ لے لیا تھا۔ وہ دونوں رات تک گاؤں پہنچ گئے۔ اور چوہدری دین محمد کو دوائی کی پہلی خوراک دے دی گئی۔ صبح تک دوائی کے اثر اور اللہ کے کرم سے چوہدری کی طبیعت میں کچھ بہتری آ گئی۔ یوں تیسرے دن چوہدری کی حالت سنبھل گئی۔ تب حکیم غلام اللہ نے اپنا معاوضہ لیا اور واپس چل پڑا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ

پودا مچھلی

سمندروں میں ایک ایسی عجیب و غریب مچھلی پائی جاتی ہے جسے پودا مچھلی کہتے ہیں۔ اس کی دم بالکل پودے جیسی ہوتی ہے یہ مچھلی سمندر میں ہمیشہ سر نیچے اور دُم اوپر کر کے تیرتی ہے۔ بڑی مچھلیاں سمجھتی ہیں کہ یہ کوئی پودا ہے جس کی وجہ سے وہ اس پر حملہ آور نہیں ہوتیں۔

مرسلہ..... عبدالباسط، ہری پور

جب اس کا گاؤں دس کوس دور رہ گیا تو اچانک چلتے چلتے اس کے گھوڑے نے ایک ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اب حکیم کے لئے پیدل جانے کے سوائے کوئی صورت نہیں تھی۔ لہٰذا مجبوراً وہ پیدل ہی چل پڑا۔ شدید گرمیوں کا موسم تھا اس گرمی میں پیدل چلنا بہت مشکل کام تھا مگر مجبوری تھی کیونکہ اس صحرا میں کوئی اور آبادی بھی نہ تھی کہ حکیم کوئی اور گھوڑا خرید لیتا۔ وہ دن بھر سفر کرتا رہا۔ اور شام کو اپنے قصبے کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت اچانک تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے جو اپنے ساتھ بادل بھی اڑا لائے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش کے پانی میں خاصی ٹھنڈک تھی۔ حکیم گھر کی طرف دوڑ پڑا مگر وہاں پہنچنے تک وہ بارش میں مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔ اتنی شدید گرمی میں پیدل سفر کرنے کی وجہ سے اس کا جسم پہلے ہی بہت گرم ہو چکا تھا...... پھر بارش کے ٹھنڈے قطروں نے کام کر دکھایا۔ اس پر فالج کا شدید حملہ ہو گیا اور فالج نے اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان کو بے کار بنا دیا۔ حکیم پر فالج کے حملے کی خبر سن کر اس کے شاگرد دوڑے آئے اور اپنے استاد سے شدید فالج کی دوائی بنانے کا طریقہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے تا کہ اسے دوا پلائی جا سکے مگر حکیم نہ تو خود اٹھ کر دوائی بنا سکتا تھا اور نہ اپنے شاگردوں کو طریقہ بتا سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کی زبان بھی مفلوج ہو گئی تھی۔ بس بے بسی کے ساتھ ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجبوراً شاگردوں نے اپنے طور پر علاج کیا اور دوسرے حکیموں سے بھی مدد لی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

حکیم غلام اللہ کا جسم اور زبان مفلوج ہو گئے تھے۔ مگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی تھی۔ اسے بار بار اپنے مہربان استاد اور سسر سیف اللہ کے نصیحت بھرے الفاظ یاد آ رہے تھے جو ایک بار انہوں نے اس سے کہے تھے "غلام اللہ بیٹے، اللہ کا دیا ہوا علم و ہنر امانت ہوتا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ دوسروں کو اپنا علم منتقل کرے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں۔"

وہ الفاظ یاد کر کے غلام اللہ کانپ جاتا اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے لگ جاتا۔ لوگ حکیم کو دیکھنے آتے اور افسوس کر کے چلے جاتے کہ یہ وہی حکیم ہے جس نے اپنا علم دوسروں سے چھپایا تو آج بے بسی کے عالم میں بستر پر پڑا ہے!!

شاید اسی وجہ سے ہوتا ہوں فیل اکثر

عبدالقادر

ہر سال فیل ہونا کیوں ہے مرا مقدر؟ — کیا میں اسے سمجھ لوں قسمت کا کوئی چکر؟
اپنے محاسبے سے کھلتا ہے راز دل پر — میرے مرض کا نسخہ اس سے نہیں ہے بہتر۔
محنت سے جی چرایا پڑھتا نہیں ہوں جم کر
شاید اسی وجہ سے ہوتا ہوں فیل اکثر

وقت عزیز میں نے میدان میں گنوایا — ساری کتابیں رکھ کر کھیلوں میں دل لگایا
یوں پورا سال گزرا اور امتحان آیا — آنکھوں کے سامنے تب گہرا اندھیرا چھایا
کوئی نہ کام آئے، جب امتحاں ہو سر پر
شاید اسی وجہ سے ہوتا ہوں فیل اکثر

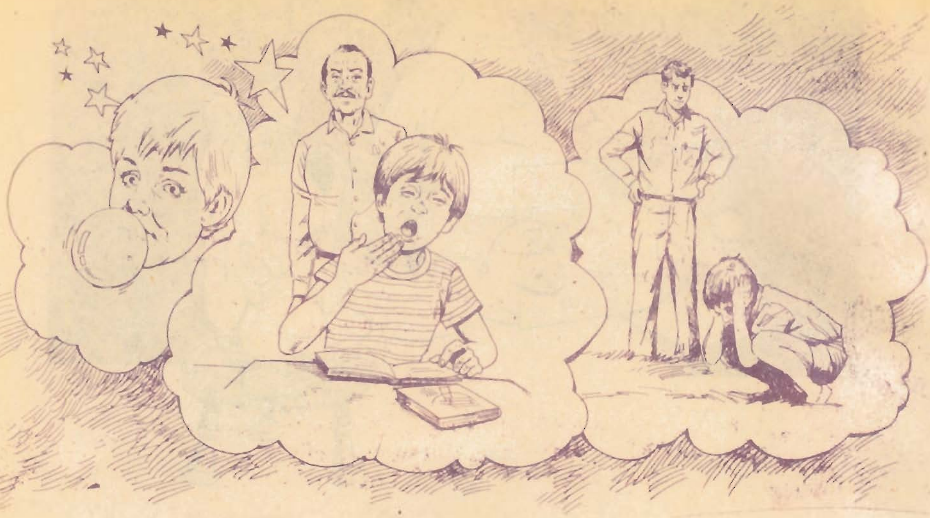

اسکول میں ہمیشہ کرتا ہوں میں لڑائی
ہوتی ہے اس بنا پر میری سدا پٹائی
اس کی قمیض پھاڑی، اس سے زباں چلائی
اپنے ہی ساتھیوں کی میں نے ہنسی اڑائی
میری شرارتوں سے نالاں ہیں سارے ٹیچر
شاید اسی وجہ سے ہوتا ہوں فیل اکثر

پڑھنے لگوں تو مجھ کو سو کام یاد آئیں
اس زور سے پڑوسی جب ریڈیو لگائیں
بچے بھی غل مچائیں اور مکھیاں ستائیں
کیسے ہو پھر پڑھائی، یہ آپ ہی بتائیں
شب خون مارتے ہیں راتوں میں آکے مچھر
شاید اسی وجہ سے ہوتا ہوں فیل اکثر

دل میں ہوا ہے میرے فلموں کا شوق پیدا
پہلے میں علم کا تھا، اب فلم کا ہوں شیدا
محبوب ہوگئے ہیں فلموں کے سارے ہیرو
سالانہ امتحاں میں ملتا ہے مجھ کو زیرو
اسباق کی جگہ ہیں فلموں کے گیت ازبر
شاید اسی وجہ سے ہوتا ہوں فیل اکثر

ہنستے ہنستے

منتخب لطائف

○ ـــ ایک ماں نے اپنے چھ سالہ بچے کو انگلی پر پٹی باندھتے ہوئے دیکھ کر ہمدردی سے پوچھا۔

"بیٹا کیا بات ہے؟"

بیٹے نے جواب دیا

"کچھ نہیں ...... مجھے ہتھوڑی سے چوٹ لگ گئی ہے۔"

ماں نے کہا۔

"بیٹے تم روئے اور چلائے نہیں!"

بیٹے نے معصومیت سے جواب دیا۔

"ممی میں سمجھا آپ باہر گئی ہوئی ہیں۔"

مرسلہ ...... فرحان خالق، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

ایک شخص ایک پرانی ٹوٹی پھوٹی ٹائم پیس لے کر گھڑی ساز کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

"اسے مرمت کر دو .... دراصل غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ یہ گھڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔"

گھڑی ساز نے ایک نظر گھڑی کی خستہ حالت کو

دیکھا اور بولا۔

"نہیں! تم سے اصل غلطی یہ ہوئی کہ تم نے اسے گرنے کے بعد پھر اٹھالیا...... کیونکہ اب اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔"

مرسلہ...... افتخار دانش، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

ایک شخص کو آنکھوں کی شکایت تھی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے آنکھوں کے آگے دائرے گھومتے نظر آتے ہیں۔ خدارا کچھ علاج کیجئے۔"

ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کا معائنہ کیا اور آنکھوں میں دوا کے چند قطرے ٹپکا کر چند منٹ آرام کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مریض سے پوچھا۔

"کہو...... کچھ افاقہ ہوا؟"

"جی ہاں...... بہت...... اب دائرے صاف نظر آنے لگے ہیں۔"

مرسلہ...... عمران خالق، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

ایک ہوٹل کے مالک نے مسافروں کی سہولت کے لئے کمروں میں نوٹس لٹکا رکھا تھا۔ جس پر لکھا تھا

"ہوٹل چھوڑنے سے پہلے تمام چیزوں کا جائزہ لے لیں، کہیں آپ کوئی چیز چھوڑے تو نہیں جا رہے۔"

ایک رات دو دوست اس ہوٹل میں ٹھہرے۔ دوسری صبح جب وہ واپس جانے لگے تو دروازے اور کھڑکیوں کے پردوں کے علاوہ اور بھی چھوٹا موٹا سامان اپنے ساتھ لے گئے۔ اطلاع ملنے پر جب ہوٹل کا مالک کمرے میں داخل ہوا تو اسے نوٹس کے ساتھ ایک پرچہ ملا جس پر لکھا تھا۔

"یاد دہانی کے لئے بہت بہت شکریہ...... ہم نے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ سوائے ان دو پلنگوں کے جن کو اٹھانا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔"

مرسلہ...... حماد عثمانی، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

سگریٹ نوشی پر پابندی تھی۔ کیپٹن فوجی بیرک کا معائنہ کر رہا تھا۔ اسے فرش پر سگریٹ کا ایک ٹوٹا پڑا نظر آیا۔ قریب ہی ایک سپاہی کھڑا تھا۔ کیپٹن نے اس سے پوچھا۔

"کیا یہ تمہارا ہے؟"

"نہیں سر۔" سپاہی نے جواب دیا۔ "آپ اسے لے سکتے ہیں۔"

مرسلہ...... نوید ہاشمی، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

فوجی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی تقریر شروع کی۔ چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا۔

"بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔" کمانڈر نے کہا۔

لمبے لمبے بالوں والوں نے اطمینان کی سانس لی۔

"آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں مگر ان کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ۔" اس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سولجر کٹ حجامت دکھائی۔ "اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔"

سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی ــ وہ گنجا تھا۔

مرسلہ...... خالد احمد پاستا، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کا ایک دوست آیا جو اسے نماز پڑھتا دیکھ کر واپس جانے لگا۔

اس شخص نے سلام پھیر کر پوچھا۔

"کیوں بھئی...... واپس کیوں جا رہے تھے؟"

دوست نے جواب دیا۔

"اور کیا کرتا...... تم تو نماز پڑھ رہے تھے...... اس لئے واپس جا رہا تھا۔"

"نماز ہی پڑھ رہا تھا کوئی لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا۔"

اس شخص نے کہا۔

مرسلہ...... نوید اختر، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

ہسپتال میں ایک پاگل شور مچا رہا تھا۔

"مجھے آزاد کر دو...... ورنہ میں ہسپتال کی چھٹی منزل سے کود کر خودکشی کر لوں گا۔"

"لیکن ہسپتال تو صرف تین منزلہ ہے۔" ایک نرس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں میں دو مرتبہ چھلانگ لگا لوں گا۔"

مرسلہ...... عدنان رشید، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

ہوٹل پہنچ کر ایک گاہک نے بیرے سے کہا۔

"چائے لاؤ۔"

بیرے نے کہا۔

"جناب...... وی آئی پی چائے تین روپے کی ہے...... اسپیشل چائے دو روپے کی ہے اور ریزرو چائے ایک روپے کی ہے...... آپ بتائیں کون سی چائے لاؤں؟"

گاہک نے پوچھا۔

"یہ ریزرو چائے کون سی ہوتی ہے؟"

بیرے نے جواب دیا۔

"ریزرو چائے ہمارے ہاں وہ ہوتی ہے جو گاہک کپوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم اسے ضائع نہیں کرتے بلکہ اس سے غریب گاہکوں کی خدمت کرتے ہیں۔"

مرسلہ...... شمائلہ شکیل، لاہور۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

ایک دعوت میں حسن اتفاق سے ایک ذہین مگر ناکام اداکار اور ایک ڈاکٹر پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ دوران گفتگو ڈاکٹر نے اداکار سے کہا۔

"آپ کا پیشہ بڑا گھٹیا ہے۔ آپ نے میڈیکل

لائن اختیار کی ہوتی تو کیا کہنے تھے۔"

اداکار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن ایک نالائق اداکار ہونا پبلک کے لئے اتنا خطرناک نہیں، جتنا ایک نالائق ڈاکٹر ہونا۔"

مرسلہ...... احتشام علی خان، پشاور

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

پہلا دوست: ۔ توبہ! اس سے بری بات کیا ہوگی کہ امرود کھاتے ہوئے اس میں اتنا بڑا کیڑا دکھائی دے۔

دوسرا دوست: ۔ اس سے بری بات کیا ہوگی کہ اتنے بڑے کیڑے کا آدھا حصہ دکھائی دے۔ آدھا تو آپ کھا چکے ہیں۔"

مرسلہ...... ندیم شاہد، خانیوال۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

دکاندار نے اپنے ملازم کو دور سے کسی گاہک سے جھگڑتے دیکھا تو پاس بلا کر سمجھانے لگا۔

"دیکھو گاہکوں سے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے...... گاہک جو کہیں مان لیتے ہیں...... کیا کہہ رہا تھا وہ۔"

"وہ کہہ رہا تھا سر...... کہ اس دکان کا مالک دنیا کا سب سے بڑا گھٹیا آدمی ہے۔"

مرسلہ...... جنید اختر، کراچی۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

کھٹ پٹ کی آواز سن کر عورت کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ زیورات کی الماری کے پاس ایک سایہ سا کھڑا ہے۔ اس نے فوراً اپنے شوہر کو جگا کر سرگوشی میں کہا،

"اٹھو...... دیکھو کوئی میرے زیورات اڑانے کے چکر میں ہے۔ اسے روکو۔"

شوہر بولا۔

"روکوں...... اگر اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوا تو؟"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔" عورت نے کہا۔ "تمہاری انشورنس ہو چکی ہے۔ زیورات کی نہیں ہوئی۔"

مرسلہ...... صفیہ چانڈیو، خیرپور میرس۔

...... ○ ...... ○ ...... ○ ......

بیوی بچے کو ڈانٹ رہی تھی۔ شوہر نے پوچھا

"کیوں ڈانٹ رہی ہو بچے کو؟"

"اس کم بخت نے مرغیوں کا ڈربہ کھول دیا ہے جس کی وجہ سے تمام مرغیاں باہر چلی گئی ہیں۔"

بیوی نے غصہ سے کہا۔

"بھئی اس میں غصے کی کیا بات ہے...... شام تک واپس آجائیں گی۔" شوہر نے کہا۔

بیوی فوراً بولی،

"واپس کہاں سے آجائیں گی...... سب اپنے اپنے گھر چلی گئی ہوں گی۔"

مرسلہ...... رفیع احمد کاش، فیصل آباد۔

عینی کو ممی کا انتظار ہے

فائقہ رحمان

"عینی بیٹے کھانا کھالیں۔" آپا ماں نے پیار سے عینی کو بلایا۔ "نہیں آپا ماں میں ممی کے ہاتھوں سے کھانا کھاؤنگی۔" عینی مچل کر بولی۔ "مگر بیٹے آپ کی ممی تو اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔" آپا ماں نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا۔ "نہیں آپا ماں۔ میں ممی کے ہاتھوں سے کھانا کھاؤنگی۔ آپا ماں! آپ ممی کو فون کیجئے ناکہ وہ آجائیں اور آپا ماں آپ ممی کو یہ بھی کہئے گا کہ وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں اور ان کے بغیر مجھے نیند بھی نہیں آتی۔" عینی معصومیت سے بولی تو آپا ماں کا دل دکھ سے بھر گیا۔ "لیکن بیٹے۔ اللہ میاں کے پاس جاکر تو کوئی واپس نہیں آتا۔" آپا ماں بولیں۔ "تو پھر مجھے بھی ممی کے پاس لے جائیں۔ مجھے ممی کے پاس جانا ہے۔" عینی مچل مچل کر رونے لگی تو آپا ماں اسے دکھی دل سے چپ کرانے میں لگ گئیں۔

عینی چار سال کی پیاری سی گول مٹول سی بچی تھی۔ اس کی ممی کا بم کے ایک دھماکے میں انتقال ہوگیا تھا۔ چونکہ وہ بہت چھوٹی تھی چنانچہ شروع میں وہ اپنی ممی کی موت کو قبول نہ کر پائی تھی مگر آہستہ آہستہ وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ وہ لاکھ روئے، چیخے، چلائے مگر اس کی ممی اس کے پاس واپس نہیں

آسکتیں کیونکہ وہ مرچکی ہیں۔یہ بات جان لینے کے باوجود اسے اپنی ممی کا انتظار تھا۔ جب وہ دوسرے بچوں کو ان کی ماؤں کے ساتھ دیکھتی تو اس کا انتظار اور بھی شدید ہو جاتا۔ اس روز بھی اس نے آپا ماں سے چھپ کر اپنی گیند اٹھائی اور گھر سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے پارک میں کھیلنے چل دی۔ پارک میں پہنچ کر وہ کھیل میں مگن ہو گئی۔ اس نے گیند کو ایک کک لگائی اور اسے پکڑنے دوڑی تو اچانک سامنے سے دوڑ کر آتے ہوئے بچے سے ٹکر ہو گئی۔ دونوں دھڑام سے گر پڑے۔ بچے کو گرتا دیکھ کر اس کی ماں دوڑتی ہوئی اس کی جانب آئی اور اسے پیار سے سہلاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئی۔ عینی حسرت سے اس بچے کو، اس کی ماں کو جاتا دیکھتی رہی۔ اسے اپنے گھٹنے سے بہنے والے خون کی بھی پروا نہ تھی۔ جب وہ بچہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ تیزی سے اپنے گھر کی جانب دوڑی اور اپنے کمرے میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آپا ماں نے جب اسے اس طرح سے اپنے کمرے کی جانب جاتے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئیں۔ "ارے بیٹا کیا ہوا۔ رو کیوں رہی ہیں آپ؟" آپا ماں نے اسے روتا دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔ "آپا ماں۔ سب بچوں کی ممیاں ہوتی ہیں، پھر میری ممی کیوں مر گئی ہیں؟" وہ مسلسل روئے چلی جارہی تھی۔ آپا ماں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ان کی نظر اس کے گھٹنے سے بہتے خون پر پڑی۔ آپا ماں سب کچھ بھول کر اس کا زخم صاف کرنے میں لگ گئیں۔

○ ..... ○ ..... ○

اس روز آپا ماں کچھ ضروری خریداری کرنے بازار جارہی تھیں۔ عینی بھی ضد کر کے ان کے ساتھ ہولی۔ راستے میں ایک پرندے والے کے پاس کبوتروں کا ایک جوڑا دیکھا۔ جن کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے کبوتر کے بچے بھی تھے۔ عینی کبوتروں کے جوڑے کو خریدنے کے لئے مچل گئی۔ آپا ماں نے اس کا اصرار دیکھ کر اسے کبوتروں کا وہ جوڑا اور ان کے بچے دلا دیئے۔ عینی انہیں پاکر بے حد خوش تھی۔ دونوں بچوں کے نام اس نے پنکی اور بنٹی رکھ دیئے تھے۔ وہ ان کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ انہیں وقت پر دانہ کھلاتی اور روزانہ شام کے وقت انہیں پارک لے جایا کرتی۔ پارک میں موجود بچوں کے لئے بھی کبوتر تفریح کا ذریعہ ہوتے تھے۔ زندگی یونہی سکون سے گزر رہی تھی کہ نجانے اس سکون کو کس کی نظر لگ گی۔ شہر میں ہنگامے شروع ہو گئے اور آئے دن لوگ مرنے لگے، کبھی کوئی عمارت بم پھٹنے سے تباہ ہو جاتی تو کبھی اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ سے پتا نہیں کتنے گھروں کے چراغ گُل ہو جاتے۔ آپا ماں اور عینی کے ڈیڈی ان ہنگاموں سے شدید خوفزدہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عینی کا گھر سے نکلنا اور پارک جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ عینی گھر میں سارا دن پنکی بنٹی اور ان کے ممی ڈیڈی کے ساتھ کھیلتی

رہتی۔ رات جب وہ سونے لیٹتی تو ڈیڈی کو دن بھر کی تفصیل بتاتی۔ "ڈیڈی پتہ ہے آج پنکی بنٹی کی ممی کتنے پیار سے انہیں دانہ کھلا رہی تھیں اور جب وہ شرارتیں کرنے لگے تو ان کی ممی نے انہیں ڈانٹا بھی تھا۔ اور ڈیڈی جب گولیاں چلنے کی آواز آئی تھی نا تو پنکی بنٹی اپنی ممی کی گود میں چھپ گئے تھے۔ ڈیڈی پتہ ہے اس وقت مجھے بھی اتنا ڈر لگ رہا تھا۔ میرا بھی دل کر رہا تھا کہ میں بھی اپنی ممی کی گود میں چھپ جاؤں۔ ڈیڈی میری ممی واپس کیوں نہیں آتیں؟ آپ انہیں کہیں نا کہ وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔" عینی روہانسی ہو گئی تو ڈیڈی اسے سونے کا کہہ کر خود بھی سونے چل دیئے۔

اس روز عینی نے آپا ماں سے پارک جانے کی اجازت مانگی کیونکہ کئی روز سے وہ پارک نہیں گئی تھی اور گھر میں بیٹھے بیٹھے وہ تنگ آ گئی تھی۔ مگر آپا ماں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ "مگر آپا ماں۔ اب تو گولیاں بھی نہیں چلتیں۔" عینی بولی مگر آپا ماں نے اسے سختی سے پارک جانے سے منع کر دیا۔ عصر کے وقت آپا ماں رات کے کھانے کی تیاری کے لئے کچن میں چلی گئیں۔ عینی نے کبوتر کا پنجرہ اٹھایا اور نظر بچا کر گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ پارک کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک جانب سے چند موٹر سائیکل سوار آئے اور گولیوں کی بوچھاڑ کر کے پلک جھپکتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک گولی عینی کے بازو کو چھیلتے ہوئے گزر گئی۔ پنجرہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ خون کی ایک دھار اس کے ہاتھ سے بہہ نکلی۔ اس کے ہاتھ میں شدید جلن ہو رہی تھی مگر وہ اپنے ہاتھ کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے پنجرے کی جانب دوڑی۔ پنکی اور بنٹی بے چینی سے اپنے پر پھڑپھڑا رہے تھے اور ان کی ممی ایک جانب خون میں لت پت پڑی تھی۔ ایک گولی اس کے جسم کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ عینی نے پنجرہ کھول کر اس کے مردہ جسم کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ چند لمحے سکتے کے سے عالم میں اسے تکتے رہنے کے بعد اس کے منہ سے نکلا۔ "ممی مر گئی!"

اعلان

پاکستان ینگ رائٹرز فورم (پنجاب) کے زیر اہتمام منعقدہ کل پاکستان مقابلہ نظم، کہانی و مضمون نویسی کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ منصفین کے فرائض ممتاز دانشور اور ادیب، میرزا ادیب اور ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی نے انجام دیئے۔

نتائج کے مطابق <u>مضمون نویسی میں</u> بالترتیب اوّل، دوم، سوئم علی رضا، خوشلب عنبرین درّانی، سرگودھا، عاصم شہزاد، میلسی وہاڑی، <u>کہانی میں</u>: یاسمین حفیظ، کراچی یاسمین کنول، پسرور سیالکوٹ، محمد علی باری، کراچی، اور <u>نظم میں</u>: علی ارمان، راولپنڈی آفتاب علی تیمور، چکوال، فاطمہ فاروقی، راولپنڈی انعامات کے حقدار قرار پاتے۔

کوئی ایسا تحفہ لائے
جو دل میں پھول کھلائے
احمد
بہترین حلوے یہ تین
احمد
احمد
احمد
سوہن حلوہ - حبشی حلوہ - کراچی حلوہ
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-۱۱۲۰، نورس روڈ، سائیٹ، کراچی

کھینچ کھانچ کر لاتا ہے سب کو مل کر کھاتا ہے

اسے کھینچ کر گھر تک لایا
پھر سب نے مل کر کھایا

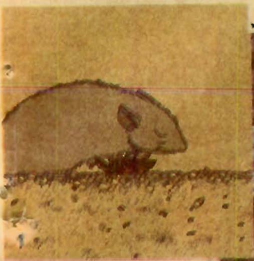

گورکن بھنورا ۔ فوڈ فیکٹری بنانے کے لئے ایک مُردہ چڑیا کا جائزہ لیتے ہوئے

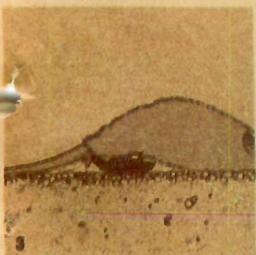

کھاتے پیتے بچے، ہیپی ہیپی اماں

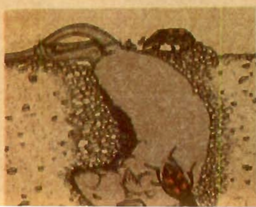

گور کن بھنورا

فوزیہ شمیم

ایک مخصوص بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی
"آہا...... مزا آ گیا۔" اس نے سوچا اور بُو کے تعاقب میں اس مقام تک پہنچ گیا جہاں اس کا شکار موجود تھا۔ یہ ایک موٹا، مُردہ چوہا تھا جو کل رات مرا تھا اور خشک پتوں پر مڑا تڑا پڑا تھا۔ گور کن بھنورے نے فضا میں چند چکر کاٹے خوب گھوم پھر کر ماحول کا جائزہ لیا۔ پھر لاش کے اوپر اتر آیا۔ اس نے لاش کا بھی اچھی طرح معائنہ کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا یہ چوہا، اس کا اور اس کے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی رہے گا۔ مکمل چیک اپ کے بعد اس نے فیصلہ دیا کہ یہ مناسب ترین اسٹاک ہے۔

اب اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ بھنورے نے لاش سے اتر کر زمین پر قدم رکھا اور مٹی میں اپنا سر گاڑ دیا۔ لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ زمین خاصی سخت ہے۔ یہ جگہ اس کے لئے مناسب نہیں تھی۔ کیونکہ اسے تو چوہے کو زمین میں دفن کرنا تھا۔ جہاں وہ،اس کی بیگم اور بچے اس کے گوشت سے اپنا پیٹ بھرتے۔ خوراک کے اتنے بڑے ذخیرے کو یونہی کھلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا ناں......
باہر جنگل میں کیا بھروسا...... کوئی دوسرا بھنورا یا کیڑا مکوڑا اس چوہے کو ہڑپ کر جاتا۔ اس بھنورے نے چوہے کو سب سے پہلے دیکھا تھا۔ لہٰذا اس سارے کے سارے پر اسی کا حق تھا۔

بھونرے نے زمین کو سونگھتے اور ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے ایک طرف کو چلنا شروع کیا۔ ایک ...... دو...... چار...... چھ...... پورے تیس قدم چلنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ اب جو زمین اس کے قدموں تلے تھی وہ اتنی نرم ضرور تھی کہ بھنورا آسانی سے اس میں کھدائی کر لیتا۔ وہ اڑا اور واپس چوہے کے پاس پہنچ گیا۔ لاش کو قبر تک لانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ چوہا، بھنورے سے کئی گنا لمبا اور بیسیوں گنا وزنی تھا۔ بھنورے نے اسے منہ سے پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی۔ پورا زور لگانے کے باوجود وہ چوہے کو ایک جنبش دینے میں بھی ناکام رہا۔ وہ اڑا، بھنبھنایا...... لاش کے اوپر اترا۔ بے چینی سے پورے جسم پر پھرا...... اس نے رینگتے ہوئے چوہے کے نیچے گھسنا شروع کیا۔ اپنی مضبوط کمر اور طاقتور ٹانگوں کی مدد سے اس نے چوہے کو اپنے اوپر گھسیٹ لیا۔ پھر بالکل کسی باڈی بلڈر کی طرح اس نے "بیک پل اوور" کی ایکسر سائز شروع کی۔ وہ ٹانگوں کو سر کی طرف لاتا، مضبوطی سے چوہے کو پکڑتا اور اپنے جسم کے اوپر سے اسے اپنی دُم کی طرف دھکیل دیا...... اس کے

چیو تیزی سے چل رہے تھے اور چوہا آہستہ آہستہ اس کے اوپر سے رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ حتیٰ کہ چوہے کی لاش نے اپنی لمبائی کے مطابق فاصلہ طے کر لیا۔ بھنورا سیدھا ہوا۔ پھر ٹھوڑی کے نیچے گھسا اور پھر وہی مشق شروع ہو گئی۔ کئی بار یہ عمل دہرانے کے بعد آخر کار بھنورا چوہے کو اپنی مطلوبہ جگہ تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے سخت جسمانی محنت کی تھی۔ وہ بُری طرح تھک چکا تھا...... اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ ایک ملی میٹر قبر کھود سکے...... جبکہ چوہا تو کئی انچ لمبا چوڑا تھا۔ اس نے کچھ دیر آرام کرنے کا ارادہ کیا اور چوہے کی لاش پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ آرام کرتے ہوئے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ اپنی مدد کے لئے بیگم کو بلایا جائے...... آخر اس میں سے اسے بھی کھانا تھا اور پھر میاں بیوی تو ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنی ہی چاہئے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے بیگم کو بلانے کے لئے اپنی دم کے ذریعے ایک تیز اور مخصوص بو فضا میں بکھیری۔ گورکن بھنورے کی سونگھنے کی حس بہت زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ وہ بہت دور سے، حتیٰ کہ زمین میں دبی ہوئی اشیا کی بو بھی سونگھ لیتا ہے۔ بھنورے نے تقریباً ایک گھنٹے تک بیگم کو "آوازیں" دیں۔ (شاید بیگم سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھیں) ایک گھنٹے کے بعد موصوفہ بھنبھناتی ہوئی وہاں آن پہنچیں۔ پہلے تو بھنورے نے اسے غصے سے گھورا...... پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ کھدائی جیسے مشکل کام کے لئے موڈ کا ٹھیک ہونا ضروری ہے۔ اس نے غصہ تھوک دیا اور بیگم سے کہا کہ جلدی سے کام شروع کیا جائے۔

دونوں نے مل کر کھدائی کا آغاز کیا۔ بھنورے نے چوہے کی ناک کے نیچے سے کھدائی شروع کی وہ منہ اور ٹانگوں سے کدال اور بیلچے کا کام لے رہا تھا۔ وہ کھودتا جاتا اور مٹی کو گڑھے سے باہر پھینکتا جاتا۔ جلد ہی وہاں ایک چھوٹا سا گڑھا بن گیا اور چوہے کی ناک اس گھڑے میں داخل ہو گئی۔ دونوں مل کر کھدائی اور دبائی میں مصروف ہو گئے۔ بہت دیر کی محنت کے بعد انہوں نے چوہے کو ایک گیند کی طرح گول اس قبر میں کھینچ لیا اور اوپر مٹی ڈال کر خود بھی لاش کے ساتھ ہی نیچے دفن ہو گئے۔

دفنانے کے مرحلے سے گزر کر انہیں اطمینان ہوا کہ اب کم از کم خوراک کے چھن جانے یا ضائع ہو جانے کا خدشہ نہیں تھا۔ دونوں نے مل کر چوہے کو "فوڈ فیکٹری" میں تبدیل کرنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے تیز دانتوں کی مدد سے چوہے کی کھال اتاری اور اپنے جسموں کی رطوبت سے خوب رگڑ رگڑ کر اس کی مالش کی۔ اس طرح انہوں نے چوہے کے گوشت کو گلنے سڑنے سے محفوظ کر لیا۔

اب کھدائی کا نیا مرحلہ شروع ہوا۔ بھنوری نے اس قبر سے زمین کے اندر ہی اندر ایک سرنگ

نکالنا شروع کی اور تھوڑی دور جا کر اپنا بیڈ روم بنا لیا۔ یہاں اس نے انڈے دیئے اور انہیں سینا شروع کر دیا۔ تین دن کے بعد انڈوں سے لاروے نکل آئے۔ ماں باپ کے لئے نئی مصروفیت شروع ہوئی۔ انہوں نے خوراک کے ذخیرے کو کھانے کے قابل بنایا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے لاش کے اوپری حصے پر اپنے دانت گاڑے اور ایک ننھا سا سوراخ نکالا پھر منہ بھر گوشت نوچا اور دوبارہ اس سوراخ میں پھینک دیا۔ یوں وہ ننھا سوراخ بڑا ہوتا رہا اور گوشت جوس کی شکل اختیار کرنے لگا۔ یہ جوس اس پورے خاندان کی مرغوب غذا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے نو زائیدہ بچوں کو ڈنر کی دعوت دی۔ انہوں نے اپنے پروں کو اپنی دُم سے رگڑ کر ایک تیز آواز پیدا کی۔ بچوں نے یہ آوازی سنی اور ''ڈائننگ روم'' کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ماں باپ کے سامنے موجود تھے اور چڑیا کے بچوں کی طرح گردن اٹھا کر اور منہ کھول کر کھانے کو مانگ رہے تھے۔ ماں باپ نے انہیں چوگا دینا شروع کر دیا۔

ابھی ڈنر جاری ہی تھا کہ اچانک ایک اور بھنورا ''ڈائننگ روم'' میں نظر آیا۔ دراصل ادھر سے گزرتے ہوئے اس کی تیز حس شامہ نے چوہے کی بو محسوس کر لی تھی، اور وہ خوراک کی تلاش میں زمین کو کھودتا ہوا اس قبر میں اتر آیا۔ ماں باپ نے اسے دیکھا تو ایک دم برہم ہو گئے۔ انہوں نے کتنی محنت سے یہ خوراک حاصل کی تھی۔ جو اب ان کے بچوں کا حق تھی...... یہ ظالم بھنورا توان کے حق پر ڈاکا ڈالنے آ گیا تھا۔ اور کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ خوراک کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں کو بھی ہڑپ کر جاتا۔ دونوں نے مشتعل ہو کر ظالم بھنورے پر حملہ کر دیا۔ ظالم بھنورے نے بھی ان کو مزہ چکھانے کا ارادہ کیا تھا اور بڑے زوروں کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ تقریباً بیس منٹ، یہ جنگ جاری رہی۔ جنگ کا نتیجہ سامنے آیا تو ماں اور باپ بھنورے کی دو دو ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں۔ لیکن انہوں نے ظالم بھنورے کی گردن توڑ دی تھی۔ انہیں اپنی ٹانگوں کے ٹوٹنے کا اتنا افسوس نہیں تھا بلکہ اس بات کی خوشی تھی کہ انہوں نے اپنے بچوں کو موت کے منہ سے بچا لیا تھا۔

تھوڑے دن بعد بھنورا اس گھر کو چھوڑ کر، باہر جنگل کی فضاؤں میں پرواز کر گیا لیکن بھنوری وہیں رکی رہی۔ وہ ماں تھی اور اسے اپنے بچوں کی حفاظت کرنا ہی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد بھنوری بھی اس گھر سے رخصت ہو گئی مگر لاروے وہیں دفن رہے۔ پھر وہ پیوپا بنے اور ایک ماہ بعد پورے بھنورے...... تب انہوں نے بھی اس قبر کو خیر باد کہا۔ اور جنگل کی آزاد فضاؤں میں نکل آئے۔ کسی ایسے شکار کی تلاش میں جسے وہ دفن کر سکیں اور اپنی آئندہ نسلوں کی خوراک بنا سکیں۔ اپنی جبلت کے تحت انہیں اپنی نسل کی بقا کی بہت فکر تھی۔ انسانوں کی طرح اپنی نسل کو اپنے ہاتھوں تباہ کرنے کا ''حوصلہ'' ابھی ان میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

صبح کے تحفے

سیّد نظر زیدی

صبح سویرے جاگو بچو، چڑیوں کی چہکار سنو
قسمت والے صبح سویرے ہوتے ہیں بیدار سنو

سورج اپنی سونے روپے کی بہلی میں آتا ہے
اپنی سنہری کرنوں سے کُل دنیا کو چمکاتا ہے

شبنم کے قطروں کی صورت نور کے موتی آتے ہیں
ٹھنڈی صاف ہوا کے جھونکے سانسوں کو مہکاتے ہیں

پھول اپنی خوشبو کے تحفے کرتے ہیں تقسیم بہت
گاتی ہے خوشیوں کے میٹھے نغمے بادِ نسیم بہت

صبح سویرے اٹھنے سے انسان کو صحت ملتی ہے
صحت مل جائے تو گویا ہر اک نعمت ملتی ہے

گرد اڑاتا صحرا ہو یا جنگل ہو یا آبادی
صبح سویرے یوں لگتا ہے جیسے گھر گھر ہے شادی

نور کے تڑکے جاگو بچو صبح کا استقبال کرو
مفت کی دولت بٹتی ہے تو خود کو تم خوشحال کرو

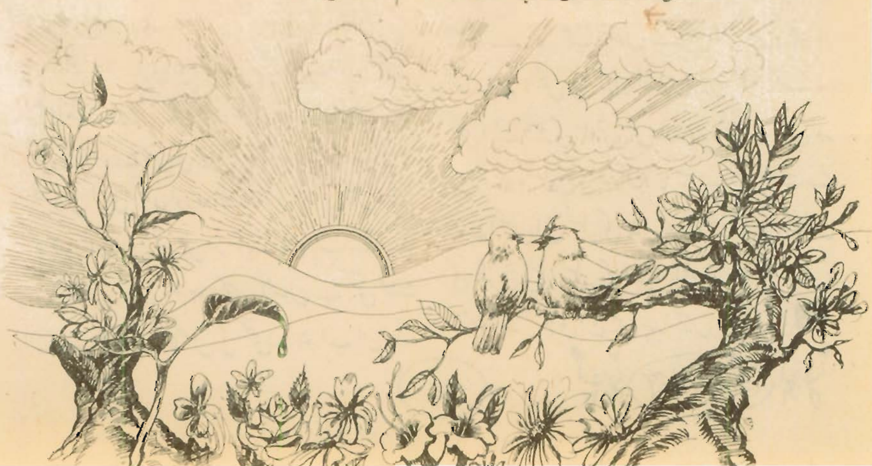

ریڈالی کی آمد

محمد عادل منہاج

دوڑتے قدموں کی آواز سن کر پروفیسر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کا نائب مارک دوڑتا آرہا تھا۔

"سر۔ پروفیسر فوراً رصد گاہ میں آئیں۔ میں نے دوربین سے ایک اڑن طشتری دیکھی ہے۔" وہ قریب آکر بولا۔

"یہ کونسی نئی بات ہے۔ ہزاروں لوگوں کو اڑن طشتریاں نظر آتی رہتی ہیں مگر ان کا وجود آج تک ثابت نہیں ہو سکا۔" پروفیسر منہ بنا کر بولے۔

"آج یہ بات ثابت ہو جائے گی۔ آپ جلدی کریں۔ وہ اڑن طشتری مسلسل نیچے آرہی ہے۔" مارک بے چینی سے بولا۔

"چلو، دیکھ لیتے ہیں۔" پروفیسر بے زاری سے اٹھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ مارک کو وہم ہوا ہو گا۔

رصد گاہ میں پہنچ کر انہوں نے دوربین پر نظریں جمائیں۔ پھر وہ اچھل پڑے اور بے یقینی کے عالم میں دوبارہ دوربین سے جھانکا۔

"اوہ...... یہ تو واقعی اڑن طشتری لگتی ہے اور ...... اور یہ تو زمین کے بے حد قریب آچکی ہے۔ زمین سے اتنے قریب تو آج تک کوئی اڑن طشتری نظر نہیں آئی۔" پروفیسر حیرت سے بولے۔

"پروفیسر! یقیناً یہ کسی دوسرے سیارے سے آئی ہے۔" مارک پرجوش لہجے میں بولا۔

"ابھی ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ اف! یہ تو لگتا ہے کہ ہمارے شہر کے اوپر پہنچ چکی ہے۔ ارے!!!" اچانک پروفیسر چونک اٹھے۔

"کیا ہوا پروفیسر؟" مارک نے بے چینی سے پوچھا۔

"اڑن طشتری میں آگ لگی ہوئی ہے۔" پروفیسر نے بتایا۔

"آگ!" مارک کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں ...... اس میں سے دھوئیں کے مرغولے نکل رہے ہیں۔ لگتا ہے اڑن طشتری کسی حادثے کا شکار ہو چکی ہے اور اسی لئے یہ اتنا نیچے بھی آگئی ہے۔ آؤ چھت پر چلتے ہیں اب تو یہ دوربین کے بغیر بھی نظر آرہی ہوگی۔" پروفیسر نے کہا اور دونوں رصد گاہ سے نکل کر چھت کی طرف دوڑے۔ چھت پر پہنچ کر انہوں نے سر اوپر اٹھا دیئے۔ اڑن طشتری بالکل واضح نظر آرہی تھی۔ وہ تیزی سے زمین کے قریب آتی جارہی تھی۔ اس میں سے دھوئیں کے گہرے بادل نکل رہے تھے۔

"یہ ...... یہ تو ایسا لگتا ہے کہ یہ سیدھی ہماری طرف ہی آرہی ہے۔" مارک بولا۔

"واقعی، رخ تو بالکل اسی طرف ہے۔" پروفیسر بڑبڑائے اور پھر اڑن طشتری واقعی ان کی رصد گاہ کی طرف آتی نظر آئی۔ یہ رصد گاہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھی۔ پہاڑی کے پیچھے جنگل تھا اور سامنے کی طرف کھلا میدان تھا۔ اڑن طشتری میدان کے عین اوپر پہنچ گئی پھر انہوں نے اڑن طشتری سے کوئی چیز نکلتی دیکھی۔ اس چیز نے نیچے چھلانگ لگا دی اور وہ میدان میں ایک طرف کو جا گری جب کہ اڑن طشتری بھی ایک زور دار دھماکے کے ساتھ میدان میں گری اور اس میں آگ لگ گئی۔ وہ دھڑا دھڑ جلنے لگی۔

"نیچے اترو۔ جلدی کرو۔" پروفیسر چلائے اور دونوں رصد گاہ سے نکل کر تیزی سے پہاڑی سے نیچے اترے اور اڑن طشتری کی طرف دوڑے مگر اس کے قریب نہ جاسکے۔ وہ بری طرح جل رہی تھی اور دور تک آگ کی حدت محسوس ہو رہی تھی۔

"ادھر دیکھیں پروفیسر۔ کوئی بے ہوش پڑا

ہے۔" مارک چلّایا۔ پروفیسر ادھر مڑے پھر تقریباً دوڑتے ہوئے اس شخص کے پاس پہنچے جو بے ہوش پڑا تھا۔

"یہ شاید اس اڑن طشتری کا پائلٹ ہے۔ اس نے اڑن طشتری کے گرنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی تھی۔" پروفیسر بولے۔

"پتہ نہیں یہ کس سیارے کی مخلوق ہے۔ ویسے تو بالکل انسانوں جیسا ہی لگتا ہے۔" مارک بولا۔ وہ شخص عجیب سے لباس میں ملبوس تھا۔ سارا جسم چھپا ہوا تھا۔ سر پر ہیلمٹ تھا۔ صرف چہرہ نظر آرہا تھا اس کا چہرہ لمبوترا سا تھا ناک بھی بہت لمبی تھی۔ ہونٹ پتلے پتلے سے تھے۔ جلد کا رنگ نیلگوں تھا۔

"مارک تم فوراً ایمبولینس کے لئے فون کرو۔ اسے ہسپتال پہنچانا ہوگا۔ افسوس کہ ہم اڑن طشتری کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ فائر بریگیڈ کے آنے تک یہ مکمل جل چکی ہوگی۔" ان کی بات سن کر مارک نے رصد گاہ کی طرف دوڑ لگا دی۔ پروفیسر اڑن طشتری کو گھور رہے تھے جس کا اب صرف ڈھانچہ ہی نظر آرہا تھا۔ وہ پوری طرح جل کر ختم ہو چکی تھی کہیں کہیں پر شعلے اب بھی ناچ رہے تھے۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

جلد ہی یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ ایک اجنبی مخلوق دوسرے سیارے سے آئی ہے۔ اسے اس شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں پہنچایا گیا مگر ڈاکٹروں کی کارروائی سے پہلے اس نے خود ہی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بیڈ کے ارد گرد بڑے بڑے سائنس دان کھڑے تھے جو یہ خبر سنتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ادھر دوڑ پڑے تھے۔ ہسپتال کے باہر اخبار نویسوں اور ٹی وی کے کیمرہ مینوں اور عام لوگوں کا ہجوم تھا مگر ابھی کسی کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔

"یہ ...... یہ تو ہوش میں آگیا۔" ایک سائنس دان بولا۔

"مم ...... مگر ہم اس سے بات کس طرح کریں۔ نہ یہ ہماری زبان جانتا ہے نہ ہم اس کی۔" دوسرا پریشان ہو کر بولا۔

"آپ لوگ اپنی زبان میں بات کریں۔ میں سمجھ لوں گا۔" اچانک اس اجنبی کے لب ہلے۔

"ارے! یہ تو انگریزی بول رہا ہے!" سائنس دان اچھل پڑا۔

"نہیں۔ میں نے اپنی زبان میں بات کی ہے۔" اجنبی نے کہا۔

"اپنی زبان میں!" پروفیسر حیرت سے بولے۔ "مگر جو تم بول رہے ہو یہ تو ہماری زبان ہے۔"

"دراصل میرے دماغ کے ساتھ ایک بہت ہی چھوٹا مائیکرو کمپیوٹر جڑا ہوا ہے جو آواز کی لہروں کو سمجھتا ہے۔ جب بھی ہم کچھ بولتے ہیں تو فضا میں لہریں بنتی ہیں۔ یہ کمپیوٹر ان لہروں سے بات کا مفہوم سمجھ لیتا ہے اور اسے میری زبان میں تبدیل

کر کے میرے دماغ میں منتقل کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب میں کچھ بولتا ہوں تو یہ میرے الفاظ دماغ میں موجود سوچ کی لہروں سے سمجھ کر انہیں آپ کی زبان میں بدل دیتا ہے۔" اجنبی نے بتایا۔

"حیرت انگیز...... یہ تو بہت عجیب و غریب کمپیوٹر ہے اور اس سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ تمہارے دماغ میں فِٹ ہے۔ لگتا ہے تمہارا تعلق کسی ترقی یافتہ تہذیب سے ہے۔"

"ہاں میرا تعلق سیارہ ریڈال سے ہے ہم لوگ ریڈالی کہلاتے ہیں۔ ہم لوگ سائنس میں اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے۔ تمہارا اپنے سیارے سے یہاں تک پہنچ جانا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ تم ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہو۔ لیکن یہ تمہارا سیارہ ریڈال ہے کہاں ؟" ایک سائنس دان نے پوچھا۔

"یہ تمہاری زمین سے پانچ نوری سال کے فاصلے پر واقع ایک اور سورج کے گرد گھومتا ہے۔" ریڈالی بولا۔

"اوہ! کیا تم ہمیں اپنے سیارے پر لے جا سکتے ہو؟" دوسرے سائنس دان نے پوچھا۔

"اپنے سیارے پر!! اوہ میں تو پوچھنا ہی بھول گیا میری اڑن طشتری کا کیا بنا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ تو مکمل طور پر تباہ ہو گئی صرف لوہے کا پنجرہ رہ گیا ہے۔" پروفیسر نے بتایا۔

"نہیں!!" ریڈالی کے منہ سے نکلا۔ "اب کیا ہوگا...... میں واپس کس طرح جاؤں گا!؟"

"کیا تم کسی طرح اپنے سیارے سے رابطہ نہیں قائم کر سکتے؟"

"رابطہ......! اف...... مجھے یاد آیا کہ اپنے سیارے کی تجربہ گاہ سے رابطے کے لئے جو ٹرانسمیٹر میرے پاس تھا وہ بھی اڑن طشتری کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہوگا...... یہ...... یہ بہت برا ہوا۔ میری واپسی خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

"جب تم واپس نہیں پہنچو گے تو تمہاری تلاش میں ہو سکتا ہے کہ دوسرے ریڈالی ادھر کا رخ کریں۔"

"انہیں بھلا کیا پتہ کہ میں زمین پر ہوں۔ دراصل ہمارے سیارے سے ایک ٹیم آج کل اڑن طشتریوں میں سوار کائنات کا جائزہ لے رہی ہے اور کوئی ایسا سیارہ ڈھونڈ رہی ہے جو زندگی کے قابل ہو۔ اس تلاش میں، میں نظامِ شمسی تک پہنچ گیا پھر مجھے زمین پر ہریالی نظر آئی تو میں نے ادھر کا رخ کیا۔ پہلے کئی دن تک دور دور سے جائزہ لیتا رہا پھر ایک دن ایک شہابِ ثاقب میری اڑن طشتری سے ٹکرا گیا اور اس میں آگ لگ گئی۔ مجھے مجبوراً زمین پر اترنا پڑا۔"

"مگر تم لوگ ایسے سیارے کی تلاش میں کیوں نکلے؟"

"کیونکہ ہمارے سیارے پر آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور ہمیں اب کسی دوسرے سیارے پر آباد

ہونا پڑے گا۔ اسی لئے یہ تلاش جاری ہے۔ اب زمین کا میرے سوا کسی کو نہیں پتہ۔ کاش میں ٹرانسمیٹر اپنی جیب میں رکھ لیتا۔" ریڈالی افسوس کرتا ہوا بولا۔

"کیا تم دوسرا ٹرانسمیٹر نہیں بنا سکتے؟"

"بنا سکتا ہوں مگر کیا اس کے لئے آلات اور دوسرا سامان زمین پر مل جائے گا کیونکہ تم لوگ تو سائنس میں ہم سے پیچھے ہو۔"

"ہم ایسا کرتے ہیں کہ تمہیں اپنے ملک کی سب سے بڑی تجربہ گاہ میں لئے چلتے ہیں۔ تم وہاں چل کر دیکھ لو کہ وہاں ٹرانسمیٹر بن سکتا ہے یا نہیں۔" سب سے بڑا سائنس دان بولا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ اب یہی کرنا ہو گا۔" ریڈالی بولا۔

○...... ○...... ○...... ○...... ○

ملک کی سب سے بڑی اور شاندار تجربہ گاہ میں اس وقت ریڈالی اکیلا بیٹھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ فی الحال اسے تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ پوری تجربہ گاہ کا جائزہ لے لے کہ یہاں موجود سامان سے اتنا طاقتور ٹرانسمیٹر بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ادھر ایک ہال نما کمرے میں بیٹھے سائنس دان بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ ریڈالی کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ سب دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ کسی طرح وہ ٹرانسمیٹر بنانے میں کامیاب ہو جائے تاکہ اپنے سیارے پر جا سکے اور پھر وہ بھی اس کے ساتھ سیارہ ریڈال پر جا سکیں اور وہاں کی ترقی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس وقت بھی ان کا ملک دنیا کا سب سے طاقتور اور ترقی یافتہ تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر انہیں سیارہ ریڈال کی ٹیکنالوجی مل جائے پھر تو وہ پوری دنیا کے بے تاج بادشاہ بن جائیں گے۔ بلکہ دوسرے سیاروں تک ان کی حکمرانی کا جال پھیل جائے گا مگر ابھی تو یہ ایک خواب ہی تھا۔ سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ ریڈالی کا اپنے سیارے سے رابطہ قائم ہو جائے یا پھر کوئی اور اڑن طشتری بھولے بھٹکے ادھر آ نکلے۔

اس وقت دروازہ کھلا اور ریڈالی اندر داخل ہوا۔

"کک۔ کیا کامیابی ہوئی؟" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

"ہاں۔ کچھ امید بندھی تو ہے مگر ابھی چند آلات اور مشینری کی مزید ضرورت ہے۔ ذرا دیکھو کیا اس قسم کے آلات مل سکتے ہیں۔ ریڈالی نے ایک کاغذ ان کی طرف بڑھایا جس پر آلات اور مشینوں کی تصویر بنی تھی۔

"اس قسم کے آلات تو ایٹمی پلانٹ میں استعمال ہوتے ہیں بھلا ٹرانسمیٹر بنانے کے لئے ان کی کیا ضرورت!" سائنس دان حیرت سے بولا۔

"تم لوگ واقعی ابھی سائنس میں بہت پیچھے ہو۔ یہ آلات صرف ایٹمی ہتھیار بنانے کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتے۔ یہ اور بات ہے کہ تم انہیں صرف تباہی کے لئے استعمال کرتے ہو۔ پر امن

کاموں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ بہرحال مجھے چونکہ ایسا ٹرانسمیٹر بنانا ہے جس سے پانچ نوری سال دور سیارے پر بات ہو سکے لہٰذا ان آلات کی اشد ضرورت ہے۔" ریڈالی نے کہا۔

"یہ آلات ہمارے ایٹمی پلانٹ والی تجربہ گاہ میں ہیں مگر وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ اس تجربہ گاہ میں ایسے ایسے تجربے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آج ہم سپر پاور ہیں۔"

"بس تو پھر مجھے ساری زندگی یہیں گزارنی ہوگی ...... کچھ کرو پلیز...... اگر میرا ریڈال سے رابطہ قائم ہو گیا تو اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔ تم ہماری ترقی سے فائدہ اٹھا سکو گے۔" ریڈالی بے چین ہو کر بولا۔

"ہوں...... یہ تو ہے...... اچھا میں حکام سے بات کرتا ہوں۔"

○ ...... ○ ...... ○ ...... ○ ...... ○

ریڈالی اس وقت اس تجربہ گاہ میں تھا جو پوری دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ جہاں خطرناک ترین ہتھیار بنائے جاتے تھے تاکہ دنیا پر حکمرانی کی جا سکے ریڈالی یہاں تنہا نہیں تھا۔ یہاں کے سائنسدانوں کا کہنا تھا کہ وہ ان کے سامنے ہی کام کرے۔ ریڈالی نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا اور سائنس دان حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

اچانک، ریڈالی اچھل پڑا۔ ایک مشین میں آگ لگ گئی تھی۔

"یہ ...... یہ کیا ہوا؟" سائنس دان چلایا۔ سب گھبرا گئے اور فوراً آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے اس دوران ریڈالی غیر محسوس طور پر تجربہ گاہ میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔

○ ...... ○ ...... ○ ...... ○ ...... ○

ریڈالی واپس سب سے بڑے سائنس دان کی تجربہ گاہ میں آگیا تھا۔

"ایٹمی پلانٹ والے ناراض ہو گئے ہیں۔ اب شاید وہ تمہیں کام نہ کرنے دیں۔" سائنس دان بولا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں نے اپنا کام کر لیا ہے۔ باقی کام اس تجربہ گاہ میں بھی ہو جائے گا اور مجھے امید ہے کہ ٹرانسمیٹر بن جائے گا۔" ریڈالی بولا۔

"واقعی!" سائنس دان اچھل پڑا۔

"ہاں! اب رات ہو رہی ہے میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ باقی کام کل کروں گا۔"

"ضرور ضرور۔ آؤ میں تمہیں کمرے تک چھوڑ آؤں۔"

○ ...... ○ ...... ○ ...... ○ ...... ○

سائنس دان صبح سو کر اٹھا تو اسے سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے سر زور زور سے جھٹکا۔ کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ پریشان ہو کر اٹھا اور باہر نکلا۔ پھر وہ ریڈالی کے کمرے کی طرف آیا مگر یہ کیا! ...... وہ اپنے کمرے میں نہیں

تھا۔

"یہ ...... یہ کدھر نکل گیا!" وہ بڑبڑایا پھر اس نے پوری تجربہ گاہ دیکھ ڈالی مگر ریڈالی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں تجربہ گاہ سے باہر نکلا تو ٹھٹھک کر رک گیا باہر موجود چوکیدار بے ہوش پڑے تھے۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

کار کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان باہر نکلا۔ ایک بوڑھا اس کے استقبال کے لئے باہر کھڑا تھا۔

"آؤ عمر حسن! تم نے کمال کر دیا۔" بوڑھا بولا۔

"کمال میرا نہیں آپ کا تھا۔ میں نے تو محض ہدایات پر عمل کیا ہے منیر انکل۔" وہ بولا۔

باتیں کرتے ہوئے وہ اس بڑی سی عمارت کے ایک کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

"یہ رہیں آپ کی مطلوبہ چیزیں۔ ان مائیکرو فلموں میں اس سپر پاور کی دونوں بڑی تجربہ گاہوں کے تمام آلات کی تصویریں ہیں۔ میرے خود کار کیمرے نے بڑے خفیہ طریقے سے تصویریں اتاریں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔" عمر حسن ہنسا۔

"خبر کیسے ہوتی ؟ وہ تو تمہیں ریڈال کی مخلوق سمجھ رہے تھے۔ اب وہ لاکھ سر کھپائیں گے پھر بھی سمجھ نہ پائیں گے کہ وہ ریڈالی کہاں گیا اور اب ہمارے پاس ان کے خفیہ ایٹمی ہتھیاروں اور ایٹمی پلانٹ کی تصویریں ہیں۔ جلد ہی ہم بھی ایک سپر پاور بن جائیں گے پھر ان کافروں کو دیکھ لیں گے۔" بوڑھا پر مسرت لہجے میں بولا۔

"یقیناً۔ اب وہ وقت دور نہیں جب دنیا میں صرف ایک سپر پاور ہوگی ...... مسلم سپر پاور۔" نوجوان نے ایک عزم سے کہا۔ اور بوڑھا سائنس دان تصور ہی تصور میں اس خواب کو تعبیر پاتا دیکھنے لگا ......!!

عجیب و غریب اخبارات

○ بھارت کے صوبہ دکن میں ایک اخبار صاف ستھرے لٹھے پر چھپتا تھا۔ اور قارئین سے درخواست کی جاتی تھی کہ پڑھنے کے بعد اسے ناشر کے حوالے کر دیں تاکہ لٹھے کو دھو کر دوبارہ اخبار شائع کیا جا سکے۔

○ ۱۹۴۹ء میں امریکہ میں ایک اخبار شائع ہوتا تھا جس کا ایک صفحہ ریشمی کپڑے پر چھپتا تھا۔ قارئین وہ صفحہ پھاڑ لیتے تھے اور اسے دھو کر استعمال کرتے تھے۔

○ کئی سال پہلے فرانس میں ایک اخبار "رومال" نکلا کرتا تھا جو رومالوں پر چھپتا تھا۔ ایڈیٹر کا خیال تھا کہ اخبار بین حضرات مطالعے سے فارغ ہو کر اسے مختلف کاموں میں استعمال کر سکتے ہیں۔

○ ٹامس ایڈیسن دنیا کا سب سے کم عمر مالک اخبار تھا اس نے ایک اخبار "ویکلی ہیرالڈ" شائع کیا جو ٹرین میں ہی چھاپ کر فروخت کیا جاتا تھا۔

مرسلہ ...... عبدالباسط۔ ہری پور

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

وطن عزیز کے قریے قریے

اور نگر نگر

ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

ان اداروں

کو اپنا باقاعدہ

ایجنٹ

مقرر کیا

ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۷۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولا بخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی

خریدنے کے لیے

اپنی تجاویز اور مشوروں کیلیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط وکتابت کے لیے: ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

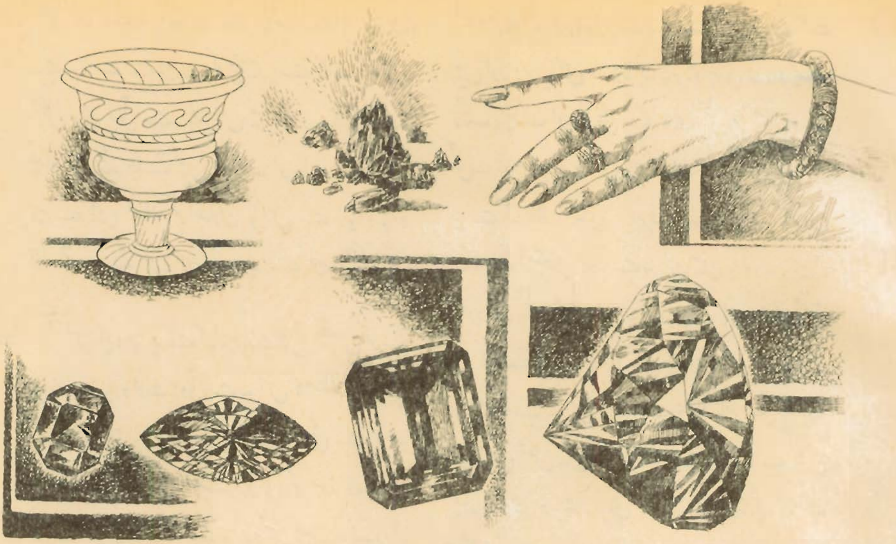

ہیرا چمکتا کیوں ہے

نگہت آرا چوہان

فرض کریں کہ ہیرے نایاب نہ ہوتے۔ وہ اتنے قیمتی نہ ہوتے اور ہر شخص انہیں حاصل کر سکتا تو کیا ہیرے کی اتنی قدر و قیمت ہوتی؟ دو باتوں کی وجہ سے لوگ ہیروں کے دیوانے ہیں، ایک تو یہ کہ ہیرا اب تک کی انسانی دریافتوں میں سب سے زیادہ سخت مادہ ہے۔ چنانچہ یہ صنعتوں میں بہت کار آمد ہے۔ دوسرے یہ کہ ہیرے بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں۔

ہیرے ایک قدرتی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ لاکھوں سالوں میں زمین بتدریج ٹھنڈی ہوئی ہے۔ لاکھوں سال پہلے زمین کے نیچے گرم چٹانی پتھروں کا پگھلا ہوا مادہ جمع تھا۔ اس مادے پر انتہائی گرمی اور دباؤ پڑا۔ اس کے نتیجے میں کاربن کے مالیکول ٹھوس شفاف قلموں کی شکل میں بندھ گئے۔ چنانچہ ہیرا دراصل خالص کاربن کی قلم ہے۔

جب ہیرا اپنی خام شکل میں ہوتا ہے تو خاصا بھدا

نظر آتا ہے۔ انسان اسے چمکدار جواہر بنا دیتا ہے۔ بہت سے ہیروں کو بیچ میں سے کاٹ کر گول شکل دی جاتی ہے، پھر اس میں چھوٹے چھوٹے پہلو تراشے جاتے ہیں۔ ایک اوسط درجے کے ہیرے میں کم از کم اٹھاون یا اس سے زیادہ پہلو تراشے جاتے ہیں ان کی وجہ سے ہیرا چمکنے لگتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہیرے میں منعکس کرنے کی بہت زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس میں روشنی داخل ہوتی ہے تو یہ دوسرے مادوں کی نسبت روشنی کو موڑ دینے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ روشنی ہیرے کے آر پار گزرنے کے بجائے مڑ جاتی ہے اور منعکس ہونے لگتی ہے چنانچہ جب ہم ہیرے کو دیکھتے ہیں تو بہت زیادہ روشنی نظر آتی ہے اور ہیرا زیادہ روشن معلوم ہوتا ہے۔ ہیرے میں روشنی مختلف رنگوں میں ٹوٹتی ہے جس کو ہیرے کی "آب" کہتے ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ ۱۴۳۰ء تک ہیرے کو زیورات کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ ایک فرانسیسی خاتون اینجی سوریل نے یہ رواج شروع کیا اور پھر یہ عام ہو گیا۔

قدیم زمانے میں مختلف جواہرات کو صرف ان کے رنگوں سے شناخت کیا جاتا تھا۔ سرخی مائل تمام قیمتی پتھروں کو یاقوت، تمام سبز پتھروں کو زمرد اور نیلے رنگ کے پتھروں کو نیلم کا نام دیا گیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ ان جواہرات میں سے بعض زیادہ سخت ہیں اور دیرپا بھی۔ چنانچہ پھر جواہر کی قدر و قیمت رنگ، چمک اور نایابی کے علاوہ سختی پر مبنی ہونے لگی۔ تمام جواہر کو قیمتی پتھر کہا جاتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ لفظ "قیمتی" صرف چار قابل قدر پتھروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ان میں یاقوت، ہیرا، زمرد اور نیلم شامل ہیں۔ دوسرے پتھر جزوی قیمتی پتھر کہلاتے ہیں۔ زمرد قیمتی پتھروں میں سب سے نرم ہوتا ہے۔ اس میں بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ اپنی مکمل شکل میں یہ شفاف گہرا سبز ہوتا ہے لیکن عموماً شاذ و نادر ہی ملتا ہے چنانچہ بہت مہنگا ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں سارے زمرد مصر کی کانوں سے حاصل کئے جاتے تھے۔ یہ کانیں اب بھی موجود ہیں لیکن ان سے بہت کم زمرد نکلتے ہیں۔ عمدہ ترین زمرد بوگوٹا کولمبیا کی کانوں میں ملتے ہیں۔ روس میں کوہِ یورال اور ایلپس میں سالز برگ کے مقام پر بھی زمرد پایا جاتا ہے۔ کچھ عمدہ قسم کے زمرد شمالی کیرولینا میں ملے ہیں اور حال ہی میں جنوبی افریقہ میں ٹرانسول میں زمرد پایا گیا ہے۔ پاکستان میں سوات کے مقام پر زمرد پایا جاتا ہے۔

زمرد کے متعلق بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ نے آخری بار جس پیالے سے پانی پیا وہ ایک بڑے زمرد سے تراشا گیا تھا۔ اس میں طبّی خواص ہونے کا یقین بھی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے فالج

کا علاج ممکن ہے۔ ایک اور داستان یہ ہے کہ زمرد کا مالک مستقبل کی باتیں بتا سکتا ہے اور اس کی سبز گہرائیوں میں دیکھنے سے ماضی کے واقعات نظر آجاتے ہیں۔ سب سے بڑا غیر تراشیدہ زمرد پانچ سینٹی میٹر لمبا ہے۔

جیڈ بھی ایک جگمگاتا ہوا پتھر ہے اور ہزاروں سالوں سے انسان کی توجہ کا مرکز ہے۔ جیڈ اکثر دو مختلف مادوں میں سے ایک میں پایا جاتا ہے یعنی جیڈ ائٹ یا نفرائٹ۔ یہ دونوں اتنی ملتی جلتی ہیں کہ صرف ماہر ہی ان میں فرق کر سکتا ہے۔ جیڈ ائٹ نفرائٹ سے تھوڑی سخت ہوتی ہے اس میں چمک دمک اور رنگ بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ جیڈ خالص شکل میں مفید ہوتا ہے لیکن اس میں کافی دھاتوں کی آمیزش سے یہ چمکدار پیلا، سرخ اور ہر شیڈ کے سبز رنگوں میں ملتا ہے۔ سب سے زیادہ مقبول جیڈ زمردی سبز یا شاہی جیڈ ہے جو بالکل شفاف ہوتا ہے۔ یہ برما سے آتا ہے کیونکہ جیڈ سخت اور ٹھوس پتھر ہے اس لئے قدیم انسان اس سے ہتھوڑے، کلہاڑی اور چاقو بناتا تھا۔ بعد میں اسے پیالوں اور زیورات میں استعمال کیا جانے لگا۔ جیڈ اتنا سخت ہے کہ اس پر نقش و نگار بنانا بہت مشکل ہے۔ اسٹیل کے چاقو بھی کام نہیں دیتے۔ چنانچہ اس پر ابھروان چیزیں پھیری جاتی ہیں۔ ایک سادہ گلدان بنانے میں دو سے تین سال لگ جاتے ہیں میکسکو میں نقشین جیڈ ملے ہیں جو ساڑھے تین ہزار سال پرانے ہیں۔ قدیم امریکی جیڈ سے آلات بناتے تھے لیکن زیادہ تر یہ مذہبی مقاصد کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ آرٹیک لوگ جیڈ کو سونے سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔

چین میں جیڈ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ تین ہزار سال سے چینی جیڈ سے خوبصورت چیزیں بنا رہے ہیں۔ چینی جیڈ کو اتنا پسند کرتے ہیں کہ بعض لوگ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب جیڈ کو چھوا جاتا ہے تو اس کی خفیہ خصوصیات ہاتھ میں لگ جاتی ہیں۔

اسے کہتے ہیں ہمت

ایک بحری جہاز پر کچھ جرمن، برطانوی اور جاپانی فوجی سفر کر رہے تھے۔ ایک دن فوج کے افسروں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ زیادہ باہمت فوجی کس ملک کے ہوتے ہیں۔ عملی مظاہرہ کرنے کی غرض سے جاپانی افسر نے اپنے ماتحت سپاہی کو جہاز کے سب سے اوپری حصہ سے چھلانگ لگانے کو کہا وہ چھلانگ لگا کر مر گیا۔ تو جاپانی افسر نے کہا "یہ ہے بہادری۔" برطانوی افسر نے اپنے سپاہی سے سمندر میں کودنے کو کہا وہ فوراً کود گیا۔ تو برطانوی افسر بولا "یہ ہے ہمت۔" آخر میں جرمن افسر نے اپنے سپاہی کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو شوٹ کر لو۔ سپاہی نے کہا۔ "میں کیوں اپنے آپ کو شوٹ کر لوں۔ کیا میں پاگل ہوں؟" اور بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔ جرمن افسر نے کہا "اسے کہتے ہیں ہمت۔"

مرسلہ:۔ عمران خالق، کراچی۔

مزید محنت کی ضرورت ہے

نا قابلِ اشاعت تحریریں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ ایسی تحریروں کے لئے واپسی کا مطالبہ نہ کریں۔ تحریر بھیجتے وقت اس کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں (ادارہ)

"نہ بن نرم اتنا" "بڑا انسان" "مجھے تم پر فخر ہے" زبیدہ کاظمی، چمبڑ سندھ۔ "نافرمانی کا انجام" محمد منیر فدوق، کراچی۔ "عظیم بیٹا" "بچے کتنے اچھے" فاطمہ تراب، حیدر آباد۔ "شان و شوکت" زاہد حسین زاہد، پسنی۔ "انجام" نورالعین سومرو، حیدر آباد۔ "پاکستان ہماری جان" ایم جاوید، پیروالہ۔ "سزا" سائرہ ہاشمی، اسلام آباد۔ "قدرت کا انتقام" عروج زہرہ، راولپنڈی۔ "باورچی خانے نے کیا خراب" سید فراز قادری (؟) "نیک دل شہزادہ" اعجاز احمد، سانگھڑ۔ "دشمن یا بجن" "ایک سبق" بشریٰ سید۔ حیدر آباد۔ "منی کی مرغی" سید مبینہ جعفری، حیدر آباد۔ "قاضی کا انصاف" مصور رضا، کراچی۔ "سنگدل اور لالچی" غلام یسین خان نیازی، فیصل آباد۔ "خالہ کے بچے" سمیرا شفیق، گجرات۔ "سات روٹیاں" صفیہ رشید چوہدری، جھنگ صدر۔ "کیسا انصاف" راؤ سجاد رشید، فیصل آباد۔ "برف کی زندگی" محمد ضیاء الحق راٹھور، میرپور خاص۔ "کیا ایسا نہیں ہوتا" "پیاری بھابھی کے نام" ملیحہ ثانیہ سحرش، واہ کینٹ۔ "واپسی" محمد حسن سروش، نواب شاہ۔ سپریم کمانڈوز" محمد شعیب حمید، بہاولپور۔ "مولا بخش کی چوری" عبدالرب بھٹی، جیکب آباد۔ "کرن" آئمہ بیدار، لاہور۔ "آپ کا دن کیسا گزرے گا" محمد آصف جاوید، تونسہ شریف۔ "زہر" تنویر حسین، کراچی۔ "غرور" شبنم جمالی، دادو۔ "بے چارہ بکرا" راجہ امتیاز حسین، راولپنڈی۔ "ایک معمولی واقعہ" صبا ارم، واہ کینٹ۔ "پراسرار چور" ثمینہ ریاض، جہلم۔ "۱۹۹۴ء کا ڈائنو سار" شیر محمد رحمانی، نواب شاہ۔ "مقدم عظمت" مراد علی ہاشمی، فیصل آباد۔ "دو بھائیوں میں صلح" محمد اکبر، مینگورہ سوات۔ "سونے سے پیار" احسن رندھاوا، حیدر آباد۔ "پادری کا جھوٹ" مرتضیٰ رضوی، کراچی۔ "چنگاری" "بس" فہیم حیدر کراچی۔ "پتھر کس نے پھینکا" آفتاب احمد انصاری، گوجرانوالہ۔ "سزا" سمیرا جمالی، دادو۔ "کشمیر بروز شمشیر" سعود غلام ملک، راولپنڈی۔ "ہماری شامت" محمد سلیم، چکوال۔ "سگریٹ یا موت" "ہم پاکستان کے مجرم ہیں" افشاں بشیر کراچی۔ "ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند" سید فرحان علی رضوی، کراچی۔ "سب سے بڑی دولت" "اور راز پالیا" "چھین لے مجھ سے" "خوش قسمت" عبدالرب بھٹی، جیکب آباد۔ "گنجا جادوگر" منظور الحسن ساگر، میاں چنوں۔ "ظہیر الدین بابر" نجم السحر سبزواری، راولپنڈی۔ "احساس کی بات" فریحہ ملک (؟) "آنکھ مچولی" خلیل فرحان بلوچ، پنجگور۔ "آزادی کشمیر" طاہر ناز انصاری، دینہ شہر۔ "اگر ہماری دم ہوتی" سید امجد حسین امجد، (؟) "خوبصورت پھول" ریحانہ کوثر، لاہور۔ "ہمدردی" "بلا عنوان" "سیدھا راستہ" عبدالرؤف کھوکھر، کراچی۔ "ویڈیو گیم ایک لعنت" ماجد حسن (؟) "نماز عصر کی اہمیت" حفصہ نبی، کوہاٹ شہر۔ "انمول تحفہ" نغمہ بانو، کراچی۔ "شیطان کی انگلی" ولی حسن، اٹک۔ "کبھی نہ ختم ہونے والا شوق" مختار حسین ہاشمی، رحیم یار خان۔ "مرغی اور کبوتر" طاہر ناز انصاری، دینہ شہر۔ "شیر اور کسان" محمد قمر زمان، صوابی۔ "قیدی" "اچھو بچھو" طاہری فخرالدین، کراچی۔ "نقل" محمد اسماعیل سرسانہ، ملتان۔ "خوبصورت دل" سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی۔

New 1994 Pharos Collection.

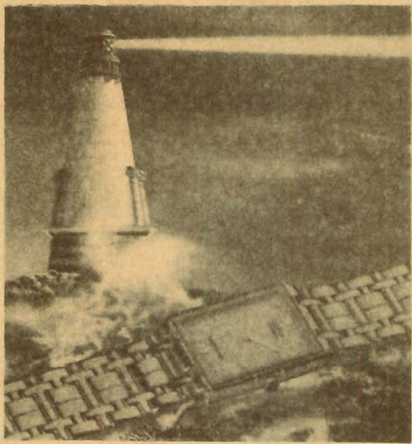

Named after the isle of Pharos, in the bay of Alexandria, Egypt, famous for its lighthouse which served as a beacon to ancient

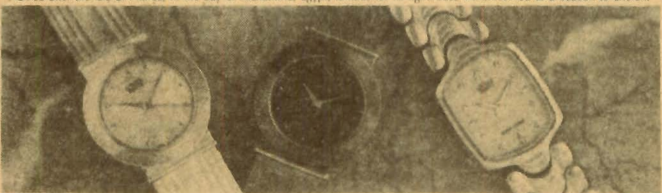

seafarers. Citizen Pharos today serves as your timely guide every moment you spend charting the course of your lifetime. Choose

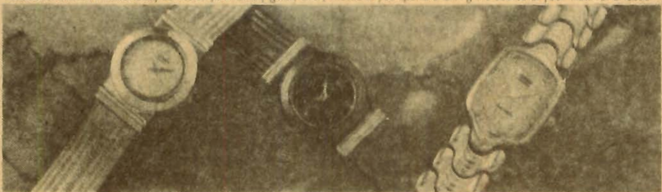

from a wide range of contemporary styled, elegant ladies and gents watches—wafer-slim, quartz powered, and water resistant.

PHAROS

Excelsior Watch Co., (Pvt) Ltd.

Shahzada Chambers, Zaibunnisa Street Saddar, Karachi.
Pone: 511504
191-Panorama Centre, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Lahore.
Phone: 631042- 631043

CITIZEN

نپولین

ایک عظیم جرنیل

قرۃ العین طاہر

آج سے دو صدی پیشتر ایک شخص نے فرانس کے جرنیل نپولین بوناپارٹ کی شہرت سن کر اپنے بیٹے کو خط لکھا اور اس خط میں نہایت مشکوک انداز میں اس نے پوچھا کہ

"آخر یہ جنرل بوناپارٹ کون ہے؟"

بیٹے نے جواب میں لکھا: "وہ ایک پست قامت شخص ہے۔ ایسا شخص قدرت زمین پر کئی صدیوں بعد ہی پیدا کیا کرتی ہے۔"

اس نوجوان نے ٹھیک ہی لکھا تھا۔ نپولین کو دنیا سے گزرے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا ہے لیکن اس کا ذکر آج بھی اس طرح ہوتا ہے جیسے ابھی حال ہی میں وہ دنیا سے رخصت ہوا ہو۔

نپولین بوناپارٹ ایک عظیم جرنیل اور فرانس کا ہردل عزیز لیڈر تھا۔ وہ بحیرۂ روم کے جزیرہ کارسیکا میں رجاشیو کے مقام پر ۱۵ اگست ۱۸۶۹ کو پیدا ہوا۔ باپ کا نام کارلو بوناپارٹ تھا اور وہ ایک بااثر اور

نپولین اور روسی جرنیل تاسار الیگزینڈر کی ملاقات کا ایک منظر

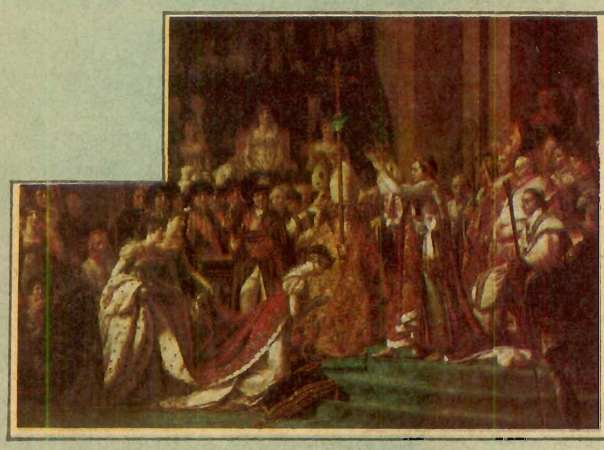

نپولین بوناپارٹ کو فرانس کی بادشاہت کا تاج پہنایا جارہا ہے

یقین+اعتماد+جدوجہد= نپولین

دولت مند شخص تھا۔ نپولین بچپن میں ایک کمزور اور بیمار دکھائی دینے والا بچہ تھا۔ جب وہ نو سال کا ہوا تو اسے تعلیم حاصل کرنے کے لئے فرانس بھیج دیا گیا۔ اکثر بڑے آدمیوں کی طرح نپولین بھی زمانہ طالب علمی میں کوئی بہت لائق اور ذہین طالب علم نہیں تھا۔ صرف ریاضی کے مضمون میں اسے غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ نپولین کی فطرت میں شروع ہی سے جنگ و جدال کا مادہ موجود تھا۔ وہ اکثر اپنے اسکول کے دوستوں کو دو گروپوں میں تقسیم کر دیتا تھا اور پھر مصنوعی جنگ لڑا کرتا تھا۔ اس کے جنگ جویانہ رجحان کی وجہ سے جب اسکول کی تعلیم مکمل ہو گئی تو انسپکٹر اسکول کی رپورٹ کی روشنی میں اسے فوج میں توپ خانہ کی ملازمت میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس ملازمت کی تربیت کے لئے اسے فوجی اکادمی بھیج دیا گیا۔ نپولین نے پاسنگ آؤٹ امتحان ایک ہی سال میں پاس کر لیا اور یوں اسے لیفٹننٹ کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں فرانس میں انقلاب کے لئے فضا ہموار ہو رہی تھی۔ خوراک کی قلت اور بے انتہا مہنگائی کی وجہ سے جگہ جگہ مظاہرے اور فساد ہو رہے تھے۔ ایسے میں ایک موقع پر نپولین نے فوج کو فسادیوں پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ نتیجے میں اسے فوج سے نکال دیا گیا۔ بعد میں جب فوج میں افسروں کی کمی ہوئی تو اسے دوبارہ اس کے عہدے پر بحال کر دیا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد اسے کیپٹن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ فوج میں افسروں کی کمی کی وجہ سے نپولین نے تیزی سے ترقی کی وہ جلد ہی لیفٹننٹ کرنل بنا دیا گیا۔ ان ہی دنوں برطانوی فوج کے خلاف اسے ایک جنگ میں حصہ لینا پڑا جس میں اس کی ران پر گہرا زخم آیا لیکن وہ دشمن پر فتح پانے میں کامیاب ہو گیا جس کے بعد اسے لیفٹننٹ کرنل کے عہدے سے ترقی دے کر بریگیڈیئر جنرل بنا دیا گیا جو فوج کا اعلیٰ عہدہ ہوتا ہے۔ اس وقت نپولین کی عمر صرف ۲۴ سال تھی۔ بعد ازاں اسے اٹلی کے خلاف مہم کا کمانڈر بھی مقرر کیا گیا۔

نپولین کی بہادری اور ولولہ انگیز قیادت کی شہرت اٹلی کے خلاف جنگوں کے دوران عام ہوئی۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے فرانس کی فتوحات کا دائرہ بے حد وسیع کر دیا۔ اس نے اٹلی، آسٹریلیا کے علاوہ بولونیا، فیرار اور رومانیہ کو فتح کر لیا۔ پھر اس نے مالٹا پر قبضہ کر کے مصر کا رخ کیا اور اسے بھی فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان فتوحات نے پورے یورپ پر اس کی دہشت بٹھا دی۔ ایک موقع پر تو عیسائیوں کی کلیسا کا پوپ بھی نپولین سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان کامیابیوں نے نپولین کو اپنی ذات پر بے پناہ اعتماد پیدا کر دیا اور وہ وقت بھی جلد ہی آ گیا جب فرانس کی بادشاہت اس کے قدموں کے نیچے تھی۔ فرانس کا بادشاہ بن کر وہ ایک کامیاب ڈکٹیٹر کے روپ میں سامنے آیا۔ اس نے اپنے ملک کے اداروں کو مستحکم کیا، افسروں کو تیز رفتاری سے کام کرنے پر مجبور کیا۔ ایک قومی

بینک قائم کیا۔ ٹیکسوں کا نظر ثانی شدہ نظام متعارف کرایا۔ پھر بھی وہ عوام کو آزادی دینے سے زیادہ ان پر اپنے اختیارات استعمال کرنے کو زیادہ ضروری خیال کرتا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے اس کے دور میں فرانس نے تیزی سے ترقی کی۔ نپولین کا زوال اس وقت شروع ہوا جب فرانس کے خلاف برطانیہ نے کئی ملکوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک متحدہ محاذ بنالیا۔ ان ملکوں میں روس، پروشیا، آسٹریلیا اور سوئیڈن شامل تھے۔ یہ ممالک کسی نہ کسی طرح نپولین کے ہاتھوں زخم کھائے ہوئے تھے۔ نپولین اس وقت بھی ایک عظیم کمانڈر تھا اور اس اتحادی قوت کو شکست دے سکتا تھا لیکن تقدیر اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اتحادی فوج نے نپولین کی فوجوں کو شکست دے کر پیرس پر قبضہ کر لیا اور یوں نپولین جلا وطن کر دیا گیا۔ نپولین نے واٹر لو کے میدان میں آخری بار جنگ جیتنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اسے گرفتار کر کے سینٹ ہیلنا کے جزیرے میں قید کر دیا گیا۔ اسی جزیرے میں اس کا انتقال ۵ مئی ۱۹۲۱ء کو ہوا۔ اس کی موت کے بعد اس کی ہدایت کے مطابق اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ جب اس کے پیٹ کو چیرا گیا تو اس کے معدے میں ایک سوراخ پایا گیا۔ یہ سوراخ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے ایک انگلی گزر سکتی تھی اور اس کا جگر غیر معمولی طور پر بڑھا ہوا تھا۔

جب نپولین کو پوری وردی پہنا کر اور اس پر تمغے وغیرہ سجا کر خاص و عام کے دیدار کے لئے باہر رکھا گیا تو اس کے وقار اور دبدبے سے ہر شخص مبہوت ہو کر رہ گیا۔ نپولین کے دشمن جنرل لونے اس کی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو میرے دوستو۔ اس کی کہانی اب ختم ہوئی۔ وہ تمام عمر برطانیہ کا اور میرا دشمن رہا لیکن اب میں اسے معاف کرتا ہوں۔ اتنے بڑے آدمی کی موت کے بعد ہمیں اس کا تذکرہ عزت و احترام سے کرنا چاہئے۔"

ہم معذرت خواہ ہیں

کچھ ناگزیر وجوہ کی بنا پر سلسلہ وار کہانی "وہ کیا راز تھا" کی بارہویں قسط اس ماہ شائع نہیں ہو سکی۔ ادارہ قارئین سے معذرت خواہ ہے۔ اس دلچسپ کہانی کے سنسنی خیز واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمایئے۔ (ادارہ)

اکتوبر کی بلاعنوان کہانی کا نتیجہ

کامران جیت گیا ــــ کامران غوری

بڑی بات ــــ انجم عروج

دل والا ــــ رفیعہ کنول

With

Best

Compliments

From

MERIN (PVT) LTD.

Dada Chamber
M.A. Jinnah Road, Karachi. Phones: 224106 - 221783

(Supplier of Automobile, Industrial Tools & Equipments)

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

انجم عروج، کراچی۔ آنکھ مچولی ہم بہت ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ آپ کا رسالہ ہمیں بہت پسند ہے کیوں کہ اس میں بہت اچھی اچھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ "وہ کیا راز تھا" بے حد دلچسپ کہانی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ رسالے کو مزید خوبصورت بنائیں تاکہ اس کا شمار اچھی کتابوں میں ہونے لگے۔ ہمیں اگلے مہینے شدت سے آنکھ مچولی کی کہانیوں کا انتظار رہے گا۔ **پارس شاہ، حیدر آباد۔** پہلی دفعہ آنکھ مچولی پڑھا بہت پسند آیا سرورق کا انتخاب بہت ہی اچھا تھا۔ شرکت کا بھی پہلا موقع ہے۔ **قرۃ العین پاشا، فیصل آباد۔** "سنہرے حروف" اور "پہلی بات" پسند آئے۔ "بنام آنکھ مچولی" میں اپنا خط بنا "خطی" دیکھ کر خوشی ہوئی (آپ خطوں کو کاٹ چھانٹ کر "خطی" بنادیتے ہیں) **اعزاز علی، حیدر آباد۔** تمام تحریریں اچھی تھیں۔ آئندہ کا خاص نمبر موٹا تازہ اور مزے دار ہونا چاہئے۔ **زبیدہ ضمیر، مسعود الحسن، جامپور۔** سرورق بہت اچھا تھا۔ اکتوبر کے شمارے میں اپنا خط دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ **محمد فاروق منیر، لاہور۔** بچوں کے تمام رسالوں میں سب سے اچھا سرورق آنکھ مچولی کا ہی ہوتا ہے۔ میری کچھ تحریریں آپ کے پاس ہیں۔ ان کے بارے میں رائے سے آگاہ فرمائیں۔ ○ ..... آپ دوسری تحریریں روانہ کریں آپ کی وہ تحریریں ناقابل اشاعت ہیں۔

عبدالستار خان طاہر، بورے والہ۔ اس دفعہ آنکھ مچولی کا شمارہ کافی پہلے موصول ہوگیا۔ اداریئے نے بہت متاثر کیا۔ تمام مضامین معلوماتی تھے۔ "وہ کیا راز تھا" اب سنسنی خیز موڑ پر پہنچ چکی ہے۔ اکتوبر کے قلم دوست صفحات میں تاریخ اسلام کے

ایک خط ایک مسئلہ

جناب ایڈیٹر صاحب!

اس خط کے ذریعے تعلیمی اداروں میں دی جانے والی چھٹیوں کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتی ہوں۔ 365 دنوں میں سے ساڑھے تین ماہ یعنی 105 دن سردیوں اور گرمیوں کی چھٹیاں دی جاتی ہیں۔ سال کے 12 مہینوں میں کل 52 چھٹیاں جمعۃ المبارک کی ہوتی ہیں۔

5 جنوری، 23 مارچ، یکم مئی، 14 اگست، 6 ستمبر، 11 ستمبر، 9 نومبر اور 25 دسمبر کی چھٹیاں الگ سے دی جاتی ہیں۔ (حالانکہ میرے خیال میں ہمیں ان تاریخ ساز ایام میں معمول سے بھی زیادہ کام کرنا چاہئے۔)

اس کے علاوہ حکومتوں کی تبدیلیوں کے موقع پر، الیکشن کے زمانے میں یا ہڑتالوں کے دوران تعلیمی اداروں کو جو چھٹیاں دی جاتی ہیں ان سب کو ملا کر طلباء کا تعلیمی سال نصف سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں ہفتے کی چھٹی دے کر سخت حماقت کا ثبوت دیا گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ حکومت نے یہ فیصلہ واپس لے لیا۔ ہفتے کی چھٹی ملنے پر جس طرح خوشی کا اظہار کیا گیا تھا اس پر حیرت بھی ہوئی تھی اور دکھ بھی۔ ہم ترقی کی دوڑ میں اس لئے پیچھے ہیں کہ ہمارا تعلیمی معیار پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ کیا دنیا کے باقی ممالک میں بھی چھٹیوں کی یہی شرح ہے۔ اگر نہیں تو ہمارے ملک میں ہی کیوں؟؟؟۔

شبانہ زمان، ہری پور۔

روح پرور واقعات پڑھا۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "غزوہ تبوک" میں حضرت خالد بن ولید کے ہاتھ سے آٹھ (بعض روایتوں میں نو) تلواریں ٹوٹیں۔ حالاں کہ یہ نو تلواریں "جنگ موتہ" میں ٹوٹیں...... جنگ تبوک میں تو لڑائی ہی نہیں ہوئی تھی۔ ○...... اس غلطی پر معذرت خواہ ہیں۔ توجہ دلانے کا بے حد شکریہ! **عالیہ فوزیہ غلام علی**، (؟) "وہ کیا راز تھا" کی کتنی قسطیں ابھی باقی ہیں پلیز بتا دیجئے ○...... بھئی! راز کی باتیں نہ پوچھا کریں۔ **مصباح فلک بلوچ، ڈیرہ غازی خان** "سنہرے حروف" ہمیشہ کی طرح سنہرے تھے۔ کہانیاں سب اچھی تھی۔ "وہ کیا راز تھا" میں سنسنی خیزی اور دلچسپی ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ اسے جاری رکھیں۔ **رفیعہ کنول، کراچی**۔ میں آنکھ مچولی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ اس کی کہانیاں بہت دلچسپ ہیں۔ خاص طور سے شمارے میں "وہ کیا راز تھا" اور "آٹھواں عجوبہ" جیسی کہانیاں مجھے بہت اچھی لگیں۔ **مسرت حسین، ضلع لودھراں**۔ تمام تحریریں اچھی تھیں۔ "ماہ رواں کی پہلی بات" پسند آئی۔ **مہر عبدالعزیز، فیصل آباد**۔ میں کسی معلوماتی اور دلچسپ رسالے کی تلاش میں تھا۔ آنکھ مچولی پڑھا تو بہت پسند آیا اب ڈیڑھ سال سے اس کا قاری ہوں۔ اکتوبر کے شمارے میں ایک جگہ لکھا تھا کہ دنیا کا سب سے پرانا درخت صنوبر کا ہے جب کہ کھجور کا درخت دنیا کا قدیم ترین درخت مانا جاتا ہے۔ **کبیر خان کانجو، بہاولپور**۔ سرورق حسین اور خوبصورت تھا۔ تمام تحریریں اچھی لگیں۔ **عبدالوہاب شیخ، جڑانوالہ**۔ بلاعنوان اچھی تھی۔ کہانیاں اور مضامین پسند آئے۔ **دُرِ ثنا سحر محمود، لاہور**۔ عادل منہاج کی "آٹھواں عجوبہ" بہترین تھی۔ قسط وار کہانی "وہ کیا راز تھا" کچھ سست روی کا شکار ہے اسے رئیس دیں۔ **شہزاد احمد خان، لاہور**۔ نومبر کا شمارہ ملا پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ کہانیاں تو سبھی اچھی تھیں لیکن "ایکشن فلموں کا راز" خصوصی طور پر پسند آیا، لطائف بھی خوب تھے۔ **مسٹر اینڈ مسز گل حسن**، (؟)۔ آپ کے ادارے نے ہمارے بچوں کو پرائز آف پوزیشن کی سند دی تاکہ بچے آپ کی نیک دعاؤں سے ترقی کر سکیں۔ آپ کا بہت

شکریہ!:- **عمارہ سلیم، شکار پور۔** اس دفعہ کا رسالہ اچھا تھا "آٹھواں عجوبہ" دلچسپ رہی۔ **نور حسین مری، میرپور خاص۔** یہ میرا چوتھا خط ہے لگتا ہے آپ نام دیکھ کر ہی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں نہ ہی آپ میری مرسلہ تحریریں شائع کرتے ہیں۔ آپ میرا دل توڑ کر اچھا نہیں کر رہے۔ ○...... بھائی! آپ کے خطوط آنکھ مچولی میں چھپتے رہتے ہیں۔ کئی بار آپ کی مرسلہ تحریریں بھی چھپیں اس کے باوجود بھی آپ ہم سے ناراض ہیں!!۔ **عدیل احمد عدی، کراچی۔** نومبر کے شمارے کا سرورق بے حد پسند آیا۔ کہانیوں میں "وہ کیا راز تھا" اچھی جا رہی ہے۔ **صدف مظفر، راولپنڈی۔** تازہ شمارہ پڑھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں لیکن سب سے اچھی کہانی محمد بن مالک کی "کٹی پتنگ" تھی۔ "پھول اور کلیاں" اور "مجھے یہ شعر پسند ہے" جیسے سلسلے پسند آئے۔ **سید ارشد شاہ، کراچی۔** نومبر کا آنکھ مچولی بے حد پسند آیا۔ اسٹیکر کا تحفہ بھی اچھا تھا۔ آپ میری تحریروں کے بارے میں بتائیں۔ ○...... آپ کی تحریریں ناقابل اشاعت ہیں۔ دلچسپ اور معلوماتی تحریر ارسال کریں۔ **سید حسنین عباس ہمدانی، کہوٹہ۔** نومبر کے شمارے میں اپنی تحریر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی لیکن آپ نے میرا نام غلط چھاپ دیا۔ ○...... بھئی بہت معذرت اور دیکھئے اس بار تو غلطی نہیں ہوئی ہے ناں؟۔ **عاصم شہزاد، ڈاہرانوالہ۔** تازہ شمارہ جلد ہی مل گیا۔ آپ کبھی کبھار کشمیر سے متعلق کہانیاں بھی شائع کر دیا کریں۔ ○...... کشمیر سے متعلق مضامین، کہانیاں اور نظمیں اکثر و بیشتر آنکھ مچولی میں چھپتی رہتی ہیں۔ کشمیر پر ہم خاص نمبر نکال چکے ہیں! اس کے علاوہ "تم عظیم ہو" کے عنوان سے نظموں کہانیوں پر مشتمل مجاہدین کشمیر کی جدوجہد آزادی کو اجاگر کرنے کے لئے ایک کتابچہ چھاپنے کا اعزاز بھی صرف آنکھ مچولی کو حاصل ہے۔ **محمد ضیاء الاسلام، ڈاہرانوالہ۔** نومبر کا آنکھ مچولی دھڑکتے دل کے ساتھ کھولا اپنا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ پرائڈ آف پوزیشن کی سند بھی مجھے مل گئی ہے...... بہت شکریہ!۔ **اورنگ زیب، چیچہ وطنی۔** آپ نے میرا یہ خط اگر شائع نہ کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ ○...... آپ کی ناراضگی کے ڈر سے آنکھ مچولی ڈر گیا ہے۔ **سید عابد مہدی کاظمی، ایبٹ آباد۔** نومبر کے شمارے میں "وہ کیا راز تھا" کے سوا تمام کہانیاں پسند آئیں۔ مضامین بھی بہت اچھے تھے۔ نظموں میں "بہادر لڑکا" اور "رونا دھونا" پسند آئیں۔ **عبدالرؤف روفی علی رشید، ملتان۔** سرورق نہایت خوبصورت تھا۔ "پہلی کمائی" "ضدی بیوی" بوڑھا قیدی" اور "وہ کیا راز تھا" بہت ہی اچھی کہانیاں تھیں۔ عبدالقادر صاحب کی نظم "بہادر لڑکا" بھی بہت پسند آئی۔ **طاہر ناز انصاری، دینہ شہر۔** "جگنو میاں کی دم" "اک نام کی خاطر" "پہلی کمائی" "چالاک خرگوش" "ضدی بیوی" اور "آٹھواں عجوبہ" پڑھ کر بہت مزا آیا۔ **رباب طاہرہ، مدینہ گجرات۔** میں بہت پہلے آنکھ مچولی سے ناراض ہو گئی تھی کیوں کہ میں ہر مقابلے میں حصہ لیتی تھی مگر کبھی فیصلہ میرے حق میں نہیں ہوا۔ میں سوچتی تھی شائد آنکھ مچولی کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں۔ اب بھی یہ پوچھنے کے لئے خط لکھا ہے کہ آپ میری تحریروں کے بارے میں رائے سے آگاہ فرمائیں ○...... بی بی! آنکھ مچولی کے لئے تمام بچے اہم ہیں آپ کی تحریریں ناقابل اشاعت تھیں اس لئے شائع نہ ہو سکیں لیکن آپ نے ہمت کیوں ہار دی۔ آپ کو تو چاہئے تھا کہ اچھی اور دلچسپ تحریریں ہمیں روانہ کرتیں۔ اچھی، دلچسپ اور معیاری تحریریں ہی آنکھ مچولی میں جگہ پاتی ہیں۔ **رفیعہ قادری، رحیم یار خان۔** آپ میرا خط ضرور شامل کریں ورنہ میرا ننھا سا دل ٹوٹ جائے گا۔ **سونیا نصیر احمد، پشاور۔** آنکھ مچولی میں جو معلومات ہوتی ہیں وہ بچوں کے لئے بے حد معلوماتی ہوتی ہیں۔ **رحمت اللہ بشیر، گجرات۔** رسالہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق بڑا ہی خوبصورت تھا۔ تحفہ بھی اچھا لگا۔ **عظیم اختر میمن، میرپور خاص۔** آپ کو بہت سی تحریریں بھیجیں لیکن آپ نے کچھ نہ چھاپا۔ ○...... اگر ہم نے آپ کی تحریریں چھاپ دی تو بچے ناراض ہو جائیں گے۔ **الماس زریں، کراچی۔** شمارہ ملا۔ سرورق بہت خوبصورت اور دلچسپ تھا۔ ماہ رواں کا

پیغام پڑھ کر ہر ماہ ہمیں ایک نئی سوچ ملتی ہے۔ راحیلہ نرگس، کراچی۔ "سنہرے حروف" مشعل راہ سلسلہ ہے۔ شاہینہ انجم، کراچی۔ کہانیوں، نظموں اور لطائف کے انتخاب پر ہم آپ کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شمارہ ہر ماہ معیاری پھولوں سے سج دھج کر گلدستہ بن کر آتا ہے۔ زاہد علی روپی (؟) "دو ماہ قبر میں" "شرارتی لکیریں" اور نظمیں بہت پسند آئیں جبکہ سرورق مزے دار تھا۔ محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ اب آپ کو "مسائل نمبر" نکالنا چاہیے جس میں ہر کہانی کا مرکزی خیال کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو۔ گل [illegible]ین عقل، ایبٹ آباد۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ فہیم حیدر، کراچی۔ "بنام آنکھ مچولی" میں گزشتہ خط کی طرح اس خط کا بھی حشر نشر کیا گیا۔...... بہت خوشی ہوئی۔ "خاص نمبر" دل کو بھایا۔ عزیز اللہ بلوچ، ڈیرہ خدا بخش۔ اس بار آنکھ مچولی بے حد پسند دیا۔ محمد رضوان محمود، کراچی۔ بہت پہلے آپ کا رسالہ پڑھا تھا جو اچھا لگا تھا لیکن پچھلا شمارہ پڑھ کر کچھ مزا نہیں آیا۔ محمد اجمل انصاری، کراچی۔ ستمبر کا خاص نمبر کافی اچھا تھا۔ "وہ کیا راز تھا" بہت بور جا رہی ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی کسی کے دماغ میں گھس کر اس کے دل کی بات معلوم کر لے!! ○ ...... بھائی! ٹیلی پیتھی بھی ایک علم ہے جو بڑی مشق اور ریاضتوں کے بعد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہما شریف، کراچی۔ آنکھ مچولی کے "خاص نمبر" کے کیا کہنے...... واہ بھئی! مزا آ گیا۔ تحفہ بھی بہت پسند آیا۔ انور صبا خان، کراچی۔ لطائف اور نظمیں اچھی لگیں۔ کہانیاں تمام شاندار تھیں۔

آنکھ مچولی کا تحفہ آپ کے دوستوں کیلئے

پچھلے شمارے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ آپ کے ایسے دوست جو آنکھ مچولی پڑھنا چاہتے ہوں لیکن اسے خریدنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، آپ ان کا نام اور پتہ کوپن پر درج کرکے ہمیں بھیج دیجئے، ادارہ ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی دس ساتھیوں کو ایک سال کے لئے آنکھ مچولی مفت جاری کردے گا۔ اس اعلان کے جواب میں ہمیں بے شمار کوپن موصول ہوئے۔ ان میں سے جن دس خوش نصیب ساتھیوں کے نام قرعہ اندازی میں نکلے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مبشر فاروق، اوکاڑہ۔ ۲۔ سیدہ سعدیہ شعیبی، کراچی۔ ۳۔ ندیم احمد، قصور۔ ۴۔ نثار احمد رحمانی، دادو۔ ۵۔ عابد علی، کراچی۔ ۶۔ اسد عباس، راولپنڈی۔ ۷۔ محمد سلمان، لاہور۔ ۸۔ مرزا اسد جہانگیر، گوجر خان۔ ۹۔ محمد عارف، کراچی۔ ۱۰۔ محمد عدیل دانی، کراچی

ادارہ ان ساتھیوں کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ آنکھ مچولی اگلے ماہ سے انہیں جاری کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ قرعہ اندازی بچوں کے مقبول لکھنے والوں جناب محمد عادل منہاج، جناب فاروق حسن چانڈیو، جناب منیر احمد راشد اور آنکھ مچولی کے تزئین کار جناب جاوید اختر نے کی۔

سردی

پروفیسر عنایت علی خان

سی سی سردی سوں سوں سردی
کان بھی ٹھنڈے ناک بھی ٹھنڈی
شبنم سے ہے سبزہ گیلا
سورج بھی ہے پیلا پیلا
صبح سویرے اٹھ جاتے ہیں
اٹھ کر کلمہ دہراتے ہیں
دن نکلے تو دھوپ میں کھیلیں
اچھلیں کودیں جھولا جھولیں
دن چھوٹے ہیں رات بڑی ہے
کام کی سب کو فکر پڑی ہے
سر پر ٹوپا پاؤں میں موزے
جیبوں میں کشمش چلغوزے
چائے پئیں اور انڈے کھائیں
اپنے رب کا شکر منائیں
جس نے سردی کے دن بھیجے
چھوٹے چھوٹے ٹھنڈے ٹھنڈے

ادارہ

عکس ادھورے کیجیے پورے

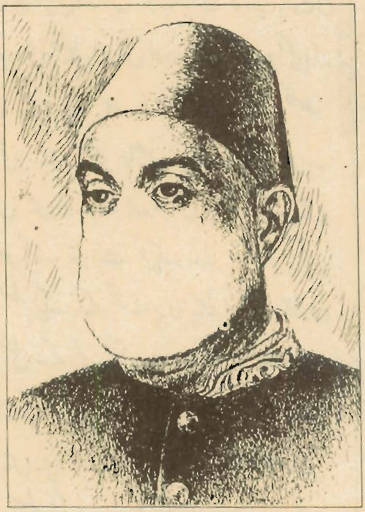

اِس مقابلے میں ہم ہر ماہ کسی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والی، دُنیا کی دو معروف شخصیات کے ادھورے خاکے شائع کرتے ہیں۔ آپ کو ان شخصیات کو پہچاننا ہے اور ان کی وجہِ شہرت بتانا ہے۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے آئندہ ماہ ہم صحیح جوابات کے ساتھ ان لوگوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شائع کریں گے۔ بالکل صحیح جواب دینے والے ساتھی کو تین ماہ کے لیے ماہنامہ آنکھ مچولی مفت ارسال کیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ درست حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ مقابلے میں شرکت کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

- ☐ جوابات الگ کاغذ پر صاف صاف تحریر کیے جائیں۔
- ☐ ہر ماہ کی دس تاریخ تک ادارہ کو موصول ہو جائیں۔
- ☐ جوابات کے ساتھ بھیجنے والے کا مکمل پتا ضرور ہو۔

ان تین شرطوں میں سے کسی ایک بھی شرط کے پورا نہ ہونے پر جوابات کو مقابلے سے خارج کر دیا جائے گا!

پتا انچارج انعامی مقابلہ "عکس ادھورے، کیجیے پورے"
ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۷۴۸۰۰

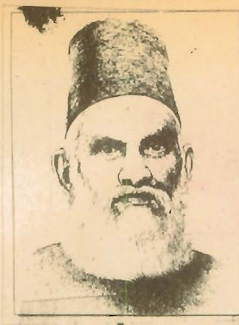

گزشتہ ماہ کے درست جوابات

چوہدری خلیق الزماں وجہ شہرت تحریک پاکستان

چوہدری خلیق الزماں اودھ کے ایک جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ وہ کچھ عرصہ کانگریس میں رہے۔ بعدازاں مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ خلافت تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر وہ پہلے یوپی کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے ممبر بنے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان ہجرت کر آئے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان مسلم لیگ کے آرگنائزر نامزد ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں پارٹی کے صدر بنے لیکن ایک سال بعد اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ وہ اپریل ۱۹۵۳ء تک مشرقی پاکستان کے گورنر رہے۔ بعدازاں انڈونیشیا میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ چوہدری صاحب کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "شاہراہ پاکستان" تحریک آزادی پر گراں قدر معلومات کا خزانہ ہے۔

وجہ شہرت تحریک پاکستان ۔ نواب محسن الملک

محسن الملک مہدی علی خان نو دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم روایتی مشرقی انداز میں حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مقابلے کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد ۱۸۷۱ء میں ریونیو انسپکٹر کی حیثیت سے بیس سال تک ریاست حیدر آباد میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ کچھ مدت کے لئے حیدر آباد ریاست کے ناظم مالیات بھی رہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ سرسید تحریک کی کامیابی میں محسن الملک کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ کیونکہ انہوں نے تحریک کے لئے انتھک محنت کی اور محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ کے قیام کو ممکن بنایا۔ یہ کالج بعدازاں ایک مکمل یونیورسٹی بن گیا۔ ۱۸۸۸ء میں وہ انگلینڈ گئے۔ وہاں سے واپسی پر انہوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مستقل طور پر اس پودے کی آبیاری میں لگ گئے جو سرسید احمد خان نے ایک کالج کی شکل میں لگایا تھا۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والی خوش نصیب

عامرہ خالق قریشی' ایبٹ آباد

بالکل درست جواب دینے والے ساتھی:۔

سائرہ سلطان' کراچی۔ حسیب اللہ' پشاور۔ اعجاز فاطمہ' سمانہ خاتون' عباس حسن' آمنہ خاتون' کراچی۔ شیر نواز گل' ارمڑپایان۔ ناصر حفیظ' ملتان۔ ندیم اقبال' رحیم یار خان۔ کامران اشفاق' لاہور۔ حنا خالق قریشی۔ عادل خالق قریشی' عامر خالق قریشی' نعمان رفیق قریشی' عامر خالق قریشی' ایبٹ آباد۔ نوید اختر' جنید اختر' کراچی۔ راشد لطیف' بہاولپور۔ ندیم اشفاق' نعیم اشفاق' نورین اشفاق' راحیل اشفاق' فہیم اشفاق' کراچی۔ گڈو' ببلی' ٹونی' حیدر آباد۔ روبینہ ناز' مخدوم پور پہوڑاں۔ ندیم شاہد' وسیم شاہد' بشریٰ شاہد' خانیوال۔ حارث شمیم' یاسر بن صغیر' کراچی۔ شمائلہ شکیل' وقاص احمد' شکار پور۔ فلزا عروج' شارب احمد' حمیرا ناز' کراچی۔ شاہدہ' شہلا' نجمہ' کراچی۔ ریحانہ بانو' شگفتہ کنول' میرپور خاص۔ زاہد بشیر' بہاولپور۔ حنا کنول' سروری بیگم' ساہیوال۔ جمیلہ عندلیب' پروین راشد' زبیدہ خاتون' دریا خان۔ محمد اکرم' محمد اسلم' بھکر۔

بچوں کے مشہور و معروف مصنف

اشتیاق احمد

کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور ناول

۵۸۶۔ انسپکٹر جمشید پارٹی' انسپکٹر کامران مرزا پارٹی
اور شوکی برادرز کی مشترکہ مہم

دائرے کا سمندر

خاص نمبر ۳۳

قیمت ـــــ ۱۵۰/- روپے

۲۰ر دسمبر ۱۹۹۴ء

کو اپنے شہر میں ہر بک اسٹال پر دستیاب ہے

ـــــ یا

پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز

۱۲/۹ نصیر آباد' گلبرگ ۳' لاہور ـــ فون ۵۷۵۶۲۷۲

آمنے سامنے

"آمنے سامنے" کی محفل میں آسٹریلوی کرکٹروں کے دلچسپ جوابات

اکتوبر کے شمارے میں ہم نے اس کالم میں آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کی ٹیموں کے کھلاڑیوں کو مہمان اعلان کیا تھا۔ بس پھر کیا تھا بچوں کے کے انبار لگ گئے، اتنے زیادہ خطوط آئے کہ پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ بچوں کے ان خطوں سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ غیر ملکی کھلاڑیوں کو بھی بے حد پسند کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ ان سارے خطوط کو ایک ساتھ شائع کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جن کھلاڑیوں کے نام زیادہ خطوط آئے ہیں ان کو وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا۔

کھلاڑیوں سے آپ لوگوں کے سوالات کے جوابات لے لئے گئے ہیں اور آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کی ٹیمیں اب واپس اپنے وطن پہنچ چکی ہیں اس لئے اب ان کھلاڑیوں کے نام مزید سوالات ارسال نہ کیجئے۔ جن ملکی کھلاڑیوں کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے ان کے نام سوالات بھیجئے۔

اکثر بچوں نے اپنے خطوں میں اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کی تصویریں اور آٹوگراف بھیجنے کی فرمائش کی ہے۔ اتنے سارے بچوں کی فرمائش پوری کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے معذرت قبول کیجئے۔ ایک بات اور۔ اس ماہ سے تین کے

بجائے صرف ایک بہترین سوال کو انعامی قرار دیا جائے گا۔ اور سوال کرنے والے بچے کو کھلاڑیوں کی آٹوگراف جواب دینے والے کھلاڑی کی تصویر اور تین ماہ کے لئے آنکھ مچولی جاری کر دیا جائے گا۔

اس ماہ آسٹریلین ٹیم کے چند کھلاڑیوں ڈیوڈ بون، مارک ٹیلر، شین وارن اور مائیکل سلیٹر کے نام سوالات کے جوابات حاضر ہیں، بقیہ آسٹریلین کھلاڑیوں کے جوابات اگلے شمارے میں شائع ہوں گے۔ جبکہ جنوبی افریقہ کے کھلاڑیوں کی باری ان کے بعد آئے گی۔

میں ابھی ریٹائر ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

(ڈیوڈ بون)

سوال ...... آپ ٹیم کے ایک سینئر ترین کرکٹر ہیں۔ آپ کے تقریباً سبھی پرانے ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں اور آسٹریلین ٹیم میں اکثریت نوجوان کھلاڑیوں کی ہو گئی ہے۔ جو بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس وقت کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہو رہا کہ اب آپ کو ریٹائر ہو جانا چاہئے؟ (عنبرین ظفر، کوئٹہ)

ڈیوڈ بون ...... بالکل نہیں، میری کارکردگی اب بھی اچھی ہے۔ اور میں فل فارم میں ہوں خوب رنز کر رہا ہوں۔ اس لئے میں ایسا کیوں سوچوں گا، جس دن مجھے یہ بات محسوس ہوئی کہ اب میں اپنی کرکٹ ٹیم پر بوجھ ہوں اسی دن میں کرکٹ کو الوداع کہہ دوں گا۔

سوال ...... بون انکل خوابوں میں آپ اب تک کتنی بار اپنی ٹیم کو ورلڈ کپ جتوا چکے ہیں؟

(بینش ظہیر، رضوان ظہیر، کراچی۔)

ڈیوڈ بون ...... خوابوں میں تو یاد نہیں لیکن حقیقت میں ۱۹۸۷ء میں ہم ورلڈ کپ جیت چکے ہیں اور اس فتح میں میرا بھی کافی ہاتھ تھا۔ میں نے شاید ۴۴۷ رنز اسکور کئے تھے۔

سوال ...... جاوید میاں داد اپنی شرارتوں سے اکثر کھلاڑیوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں کیا کبھی آپ کے ساتھ بھی انہوں نے کوئی شرارت کی ہے؟

(شہلا صدیقی، ٹنڈو آدم)

ڈیوڈ بون ...... جاوید میاں داد واقعی بہت شرارتی ہے۔ اب تو خیر وہ بہت سنجیدہ ہو گیا ہے۔ جب دنیا کے بڑے بڑے کھلاڑی اس سے نہیں بچ سکے تو میں کیسے بچ سکتا ہوں۔ لیکن اس کی شرارت سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی ہے۔

سوال ...... بون انکل یہ آپ نے اپنی مونچھیں اتنی ڈراؤنی کیوں رکھی ہوئی ہیں اس پر ستم یہ ہے کہ اتنی خطرناک مونچھوں کے ساتھ آپ فیلڈنگ بھی فارورڈ شارٹ لیگ پر کرتے ہیں۔ بے چارے بیٹسمین کی تو آپ کو اتنے قریب دیکھ کر ہی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟

(میمونہ احسان، اسلام آباد۔ عاشق علی، حیدر آباد۔ جواہر عرف جے رام داس، کندھ کوٹ۔ احسان سعد طارق، واہ کینٹ۔ تسنیم اختر، کراچی۔ شہزیم راجہ، جھڈو۔ کریم بخش، حیدر آباد۔ راحیلہ نثار، کراچی۔ حماد عثمانی، کراچی۔)

ڈیوڈ بون ...... اف اتنے سارے خطوط میری مونچھوں کے متعلق ...... اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ آپ لوگوں کو میری اس طرح کی مونچھیں رکھنا پسند نہیں ہے تو میں ایسی مونچھیں ہر گز نہیں رکھتا، مگر اب تو رکھ لیں، اس لئے کیا کر سکتے ہیں اور جہاں تک فارورڈ شارٹ لیگ پر فیلڈنگ کرنے کا سوال ہے تو یہ کپتان کی مرضی ہے کہ وہ کسی جگہ فیلڈنگ کرائے، اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

سوال ...... انکل بون اگر آپ کو تین دن کے لئے آسٹریلیا کا صدر بنا دیا جائے تو آپ سب سے پہلا کام کیا کریں گے؟

(سجاد جان قریشی، پٹار گوٹھ)

ڈیوڈ بون ...... پہلے آپ مجھے صدر بنوا دیں پھر بتاؤں گا۔

سوال ...... آپ جسامت سے تو ریسلر لگتے ہیں یہ آپ ریسلنگ کے بجائے کرکٹ میں کیسے آ گئے۔ (سجاد حسین سالک، جیک آباد)

ڈیوڈ بون ...... ریسلنگ میں بھی میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ چاہیں تو آزما کر دیکھ لیں۔

وسیم اور وقار کو کھیلنے میں کرکٹ کا صحیح لطف آتا ہے (مارک ٹیلر)

سوال ...... مارک ٹیلر صاحب جب آپ دنیائے کرکٹ کے تیز رفتار بولرز وسیم اکرم اور وقار یونس کو کھیلتے ہیں تو کیسا محسوس کرتے ہیں؟

(رابعہ وقاص، کراچی۔ فہمینہ بُرڑو، مکلی سندھ۔)

مارک ٹیلر ...... واقعی وسیم اور وقار دنیا کے خطرناک ترین فاسٹ بولر ہیں۔ ان کی بولنگ کا سامنا کر کے میں حقیقی معنوں میں کرکٹ کا اصل لطف اٹھاتا ہوں۔

سوال ...... بحیثیت کھلاڑی تو آپ نہایت شاندار بیٹنگ کرتے ہیں مگر کپتان بننے کے ساتھ ہی پاکستان کے خلاف پہلے ہی ٹیسٹ میں آپ نے پیئر

حاصل کر کے ایک نیا ریکارڈ بنایا۔ کہیں اسی کی وجہ کپتانی کا بوجھ تو نہیں؟ (محمد عالم، جھنگ۔ خالد، کراچی۔ ربیع حسن، اسلام آباد۔ سید معظم علی، گجرات۔ نثار احمد شاہانی بلوچ، دادو۔)

مارک ٹیلر ...... بالکل نہیں، کپتانی سے میری بیٹنگ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ بس آجکل فارم میں نہیں ہوں۔ آئندہ کے میچوں میں کوشش کروں گا کہ آپ لوگوں کی توقعات پر پورا اتروں، بیٹنگ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

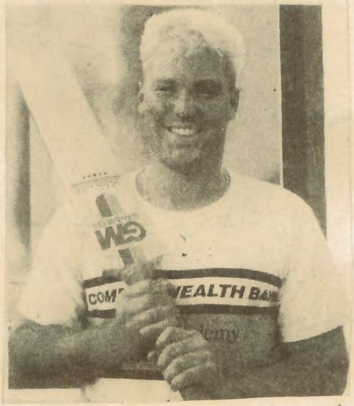

پاکستان مجھے بہت پسند آیا

(شین وارن)

سوال ...... پاکستانی عظیم بولر عبدالقادر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ (محمد شاہد غفور)

شین وارن ...... عبدالقادر واقعی ایک عظیم لیگ اسپنر ہیں، ان کی بولنگ میں بڑی ورائٹی ہے۔ میں خود ان کا مداح ہوں۔

سوال ...... آپ کو ہمارا ملک کیسا لگا؟ (قرۃ العین، ملک وال، جاوید اصغر، رحیم یار خان، سمانہ خاتون، آمنہ خاتون، عباس حسین، اعجاز فاطمہ، صائمہ، دلدار، جھمرہ سٹی، مزمل حسین شاہ، فائزہ عباس، گجرات۔)

شین وارن ...... ابھی تو ہمیں یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے ہیں لیکن پھر بھی آپ کا ملک مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ اور اب تک جتنے لوگ مجھ سے ملے ہیں۔ وہ مجھے پسند آئے ہیں۔

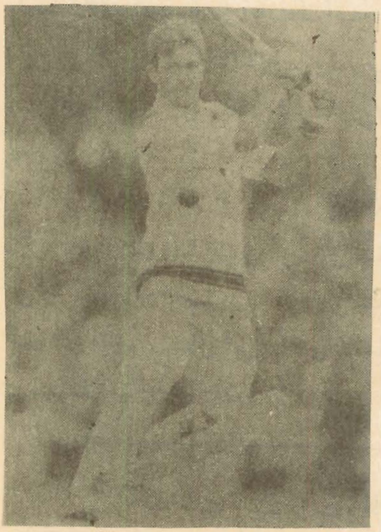

میں کسی فاسٹ بولر سے نہیں ڈرتا

(مائیکل سلیٹر)

سوال ...... سلیٹر صاحب آپ کو کن بولرز سے ڈر لگتا ہے، پاکستانی یا ویسٹ انڈین؟

(افتخار حسین تاج راہوجا، دادو)

مائیکل سلیٹر...... واقعی پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے پاس دنیا کے صف اول کے فاسٹ بولر موجود ہیں، جن کو کھیلنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یقین کیجئے مجھے کسی بولر سے خوف نہیں آتا۔ اس کا اندزہ آپ کو سیریز کے میچوں میں بھی ہو جائے گا، اگر میں بولروں سے ڈرتا تو آج میں آسٹریلین ٹیم کا ممبر نہیں ہوتا بلکہ آپ کی طرح کسی کھلاڑی سے کوئی سوال پوچھ رہا ہوتا۔

سوال ...... سلیٹر انکل پہلی دفعہ پاکستان کا دورہ کرنے پر خوش آمدید۔ ہماری دعا ہے کہ آپ اس سیریز میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ آپ نے کرکٹ کے کھیل کو کیسا پایا؟

(صائمہ ہاشمی، سمیرا ہاشمی، کراچی۔)

مائیکل سلیٹر...... ظاہر ہے اچھا پایا، تبھی تو آج تک اس کھیل کے ساتھ منسلک ہوں۔ اس کھیل سے انسان میں مقابلہ کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ میرے لئے آپ کی نیک تمناؤں کا شکریہ۔

انعامی سوال

سوال ...... شین وارن انکل، اگر آپ رات کو واک کر رہے ہوں اور آپ کا گزر قبرستان کے پاس سے ہو، ایسے میں ایک قبر سے ایک مردہ نکل کر آپ کے پاس آئے اور کہے کہ مجھے تمہارا آٹو گراف چاہئے کیونکہ میں تمہارا بہت بڑا فین ہوں۔ مگر میرے پاس قلم اور آٹو گراف بک نہیں ہے اس لئے انسانی کھوپڑی لے لو اس پر آٹو گراف دے دو اور قلم کے لئے یہ میری انگلی لے لو؟ اس وقت آپ کے کیا تاثرات ہوں گے؟

(ہمانقوی، گڈو بیراج۔)

شین وارن ..... اف آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ لگتا ہے آپ ڈرانی فلمیں بہت دیکھتی ہیں۔ ویسے اگر کبھی ایسا ہوا تو میں تو گر کر بیہوش ہی ہو جاؤں گا۔ ویسے بائی داوے کیا آپ کے یہاں مارننگ واک کے بجائے نائٹ واک کا رواج ہے؟

"آمنے سامنے" کیلئے سوالات ہر کھلاڑی کے نام الگ الگ صفحے پر تحریر کریں۔ بہت سے بچے ایک ہی صفحے پر چار پانچ کھلاڑیوں کے لئے اپنے سوالات تحریر کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑی دشواری ہوتی ہے۔ ایک بات اور "آمنے سامنے" کیلئے ہم پہلے سے تین کھلاڑیوں کے ناموں کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ان میں سے جس کھلاڑی سے پہلے رابطہ ہوتا ہے۔ اسی سے جوابات پہلے لئے جاتے ہیں۔

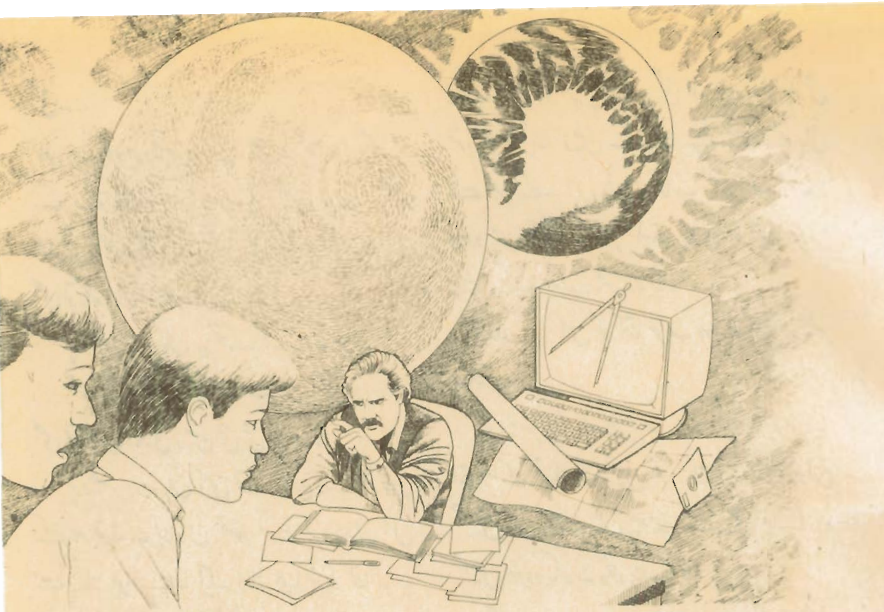

بوڑھی زمین

آفتاب حسن

حامد...... السلام علیکم، پروفیسر صاحب:

پروفیسر...... وعلیکم السلام ..... کہیئے آج کیسے تشریف لانا ہوا کیا امتحان کی فکر ہو گئی ہے؟

حامد...... جی نہیں، میں نے کہا۔ جی ہاں، امتحان کی فکر تو ہمیشہ ہی رہی ہے۔ لیکن آج آپ کے پاس ایک جھگڑا لے کر آئے ہیں۔

پروفیسر...... جھگڑا؟

حامد...... جی ہاں! محمود مجھ سے جھگڑ رہے ہیں۔

محمود...... پروفیسر صاحب جھگڑا یہ کر رہے ہیں، میں نہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے شاعر آسمان کو تو "فلک پیر" یعنی بوڑھا آسمان کہتے ہیں لیکن زمین کو کچھ نہیں کہتے...کیوں؟ کیا زمین نوجوان ہے؟ زمین کو یہ لوگ "بوڑھی زمین" کیوں نہیں کہتے؟

پروفیسر...... تو بھائی جھگڑا کیا ہے؟ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھا۔ شاعر تو جو دل میں آئے گا کہتے ہی رہیں گے پھر اس میں لڑائی کی کیا بات ہے؟

محمود...... حضرت میں کہتا ہوں کہ کیا زمین بھی کوئی زندہ چیز ہے کہ کل جوان تھی، آج بوڑھی ہو

گئی۔

حامد...... اور پروفیسر صاحب میں یہ کہتا ہوں کہ عمر کے لئے جاندار ہونا ضروری نہیں ہے۔ آخر عمارتیں بھی تو ہوتی ہیں کوئی نئی کوئی پرانی۔ ان کی بھی تو کچھ نہ کچھ عمر ہوتی ہے۔

پروفیسر...... ہاں یہ ٹھیک کہہ رہے ہو۔

محمود...... تو پروفیسر صاحب...... کوئی دن ایسا بھی تھا جب ہماری زمین نئی نئی بنی ہو؟

پروفیسر...... ہاں بھئی تھا۔ لیکن جب تم دن کہتے ہو تو اسے اپنا دن تصور مت کرو یہاں اس سے زمانہ مراد ہے۔ ایک زمانہ ایسا ضرور تھا کہ یہ زمین نئی نئی وجود میں آئی تھی۔

محمود...... کیا ایسی ہی تھی جیسی اب ہے؟

پروفیسر...... نہیں پہلے اس کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور ٹھنڈے تھے۔ پھر یہ اجزا آپس میں ملے۔ ایک دوسرے میں پیوست ہوئے۔ دباؤ بڑھا، گرمی پیدا ہونے لگی اور یہ زمین اتنی گرم ہو گئی کہ پانی اور دوسری بہنے والی چیزوں کا زمین پر قدم جمنا مشکل ہو گیا۔

محمود...... پھر کیا بالکل خشک اور گرم تھی؟ زمین پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا؟

پروفیسر...... نہیں اور ہو بھی کس طرح سکتا تھا۔ سارا پانی بھاپ اور بادل کی شکل میں اس کے اوپر منڈلاتا رہتا تھا۔

محمود...... پھر کیا ہوا؟

پروفیسر...... پھر زمین ٹھنڈی ہونے لگی۔ بھاپ سرد ہو کر پانی بن گئی اور زور دار بارش شروع ہوئی۔ زمین کے جتنے نچلے حصے تھے پانی سے بھر گئے۔ اس طرح تالاب جھیلیں اور سمندر وجود میں آئے۔ پھر سلسلہ جاری ہو گیا۔ دریا بہنے لگے۔ سمندر بھرنے لگا۔

حامد...... اس کو کتنا عرصہ ہوا ہو گا پروفیسر صاحب؟

پروفیسر...... بہت عرصہ بہت ہی بڑا عرصہ۔ اتنا بڑا کہ تم اندازہ نہیں کر سکتے...... پہلی گواہی تمہیں اس سلسلے میں سمندر سے لینی چاہئے وہ تمہیں ضرور کچھ نہ کچھ بتائے گا۔

محمود...... سمندر کیا بتائے گا پروفیسر صاحب؟

پروفیسر...... سمندر یہ بتا سکتا ہے کہ پہلے اس کا پانی بالکل میٹھا تھا۔ ظاہر ہے کہ بارش کا پانی تو میٹھا ہوتا ہی ہے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ ندیاں اور نالے زمین سے طرح طرح کے نمک دھو دھو کر لائے اور سمندر میں ڈالنے لگے تو اس کا پانی نمکین ہونے لگا۔ اور اب یہ کیفیت ہے کہ لوگ اس کی نمکینی کو برداشت نہیں کر سکتے اب اگر یہ معلوم کیا جائے کہ دنیا کے سارے سمندروں میں نمک کی کیا مقدار ہو گی اور اس کا بھی اندازہ لگایا جائے کہ نمک کس رفتار سے سمندر میں داخل ہو رہا ہے تو نہایت آسانی کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کُل نمک کتنی مدت میں جمع ہوا۔ کیوں ہے نا؟

حامد...... جی ہاں، ہو تو سکتا ہے۔

محمود ...... تو کیا اس کا کچھ اندازہ لگایا گیا ہے پر
پروفیسر صاحب؟

پروفیسر ...... ہاں اس طریقے سے مدت کم ازکم تیس کروڑ برس نکلتی ہے۔ لیکن اس طریقے پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اوّل تو سمندروں کے وجود میں آنے سے پہلے بھی زمین موجود تھی دوسرے یہ کہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر سال سمندروں میں نمک جمع ہونے کی رفتار ایک ہی تھی۔

حامد ...... کیوں؟

پروفیسر ...... کیوں کہ اس کا تعلق بارش اور خشک سالی سے ہے۔ برسات زبردست ہوئی تو بہت پانی سمندروں میں گیا۔ نہیں ہوئی تو دریا خشک ہو گئے۔

محمود ...... پھر اور دوسرا طریقہ کیا ہوگا؟

پروفیسر ...... سمندر کے بعد اب پہاڑوں اور ان کی چٹانوں کو دیکھنا چاہئے۔ وہ بھی بہت کچھ بتا سکتی ہیں۔ پہاڑ یکایک وجود میں نہیں آگئے ہیں۔ چٹانوں کو بننے میں بڑی مدت صرف ہوتی ہے۔

حامد ...... کیا اس میں بہت وقت لگتا ہے؟

پروفیسر ...... بہت زیادہ وقت! یہ تو جانتے ہو کہ پتھر خود کوئی چیز نہیں ہے۔ مٹی جب جمتی ہے اور اس پر زبردست دباؤ پڑتا ہے اور بہت مدت گزر جاتی ہے تو یہ اب سخت ہو کر چٹان بن جاتی ہے لیکن ایک فٹ چٹان بننے کے لئے تقریباً چار ہزار سال چاہئیں۔ تمہیں معلوم ہو یا نہ ہو زمین پر شروع میں لاکھوں فٹ موٹی چٹانیں تھیں ان کی موٹائی سے ان کی عمر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حامد ...... اس سے کیا مدت نکلتی ہے؟

پروفیسر ...... دو ارب سال ...... گویا اب مدت چار گنا سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ لیکن یہ طریقے اور سب دوسرے طریقے جو استعمال ہوتے ہیں وہ بس تخمینی ہیں یعنی ایک طرح کا اندازہ ہے۔ ان میں غلطی کا بہت امکان ہے۔ طریقہ ایسا ہونا چاہئے کہ جس میں غلطی سرے سے نہ ہو۔

محمود ...... تو پروفیسر صاحب ایسا کوئی طریقہ ہے؟

پروفیسر ...... ہاں ہے۔ تم نے ریڈیم کا نام تو سنا ہوگا۔

محمود ...... جی ہاں! وہ جو اسپتالوں میں کام آتی ہے۔ جس سے شعاعیں اور ذرّات نکلتے رہتے ہیں، اس سے علاج کرتے ہیں۔

پروفیسر ...... ہاں وہی۔ ریڈیم اور اس قسم کے بہت سے دوسرے عناصر ناپائیدار ہوتے ہیں۔ اس طرح تبدیل ہوتے ہوتے یہ آخر کار سیسہ بن جاتے ہیں۔ اس عمل کو تاب کاری کہتے ہیں یعنی شعاعوں کے پھینکنے والا عمل۔ ایسے عنصر کو جو یہ کام کرے، تاب کار کہتے ہیں۔

حامد ...... تو جتنا کچھ یہ سیسہ ہے وہ تاب کاری سے پیدا ہوا ہے؟

پروفیسر ...... نہیں ...... معمولی سیسے اور تاب کاری سے پیدا شدہ سیسے میں وزن کا ذرا سا فرق

ہوتا ہے جسے آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔

محمود ...... لیکن پروفیسر صاحب ...... اس سے زمین کی عمر کس طرح معلوم ہو جائے گی؟

پروفیسر ...... ذرا صبر کرو، سنتے رہو، سب بتاتا ہوں کہ تابکاری کے عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ایک خاص رفتار ہوتی ہے یعنی ایک خاص مدت میں تاب کار عنصر کی یہ ایک خاص مقدار تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ریڈیم کی کیفیت یہ ہے کہ ۱۵۹۰ سال میں اس کی مقدار آدھی ہو جاتی ہے جو آدھا حصہ بچ جاتا ہے اس کو نصف ہونے میں پھر اتنے ہی سال لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح تھوریم دوسرا تاب کار عنصر ہے جس کی مدت عمر ۱۳، ارب سال ہے۔ دوسری خاص بات اس عمل میں یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس رفتار کو کم یا بیش نہیں کر سکتی، جاڑا ہو، گرمی ہو، خشکی ہو، تری ہو، سارے تاب کار عناصر اپنی اپنی رفتار سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہیں آتا ...... سمجھ رہے ہو؟

حامد ...... جی ہاں! بالکل سمجھ رہا ہوں۔

پروفیسر ...... اچھا تو اب اگر کسی جگہ ریڈیم ملے اور اس کے ساتھ ساتھ تاب کاری سیسہ بھی ملے تو کیا سیسے کی مقدار سے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ یہ کتنی مدت میں بنا ہو گا؟

محمود ...... جی ہاں! یہ تو آسان ہے۔ اگر تبدیلی کی رفتار معلوم ہے تو اس مدت کا آسانی سے حساب لگایا جاسکتا ہے۔

پروفیسر ...... اور یاد رکھو کہ یہ مدت قطعی صحیح ہے۔ اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔

حامد ...... پھر کیا مدت نکلی؟ پروفیسر صاحب!

پروفیسر ...... ڈھائی ارب سال۔ صرف ریڈیم ہی سے نہیں، ہر تاب کار عنصر سے یہی ڈھائی ارب سال نکلتے ہیں۔

محمود ...... اچھا تو یہ زمین کی عمر ہوئی۔

پروفیسر ...... نہیں یہ کم سے کم مدت ہے۔ تم کو تو معلوم ہے کہ زمین پہلے گرم تھی اور نرم تھی اس کا مادہ پگھلا ہوا تھا اور بہتا رہتا تھا۔

حامد ...... جی ہاں یہ تو آپ بتا چکے ہیں۔

پروفیسر ...... تو جب زمین کا سارا مادہ سیال یعنی بہنے والا تھا تو اس زمانے میں ریڈیم یا کسی دوسرے عنصر سے جتنا کچھ بھی سیسہ بنا ہو گا اور بہہ کر ادھر ادھر ہو گیا ہو گا۔ تاب کار عنصر کے قریب سیسہ اسی وقت رہے گا جب وہ جگہ جم کر ٹھوس ہو چکی ہوگی۔ گویا تاب کار عناصر سے جو مدت حاصل ہوتی ہے وہ زمین کے ٹھوس بن جانے کی مدت ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین اس سے بہت زیادہ پرانی ہے۔

حامد ...... جی ہاں یہ تو صحیح بات ہے۔

محمود ...... جب آپ اس مدت کو کم سے کم بتاتے ہیں تو پھر بالکل ظاہر ہے کہ زمین کی عمر کی زیادہ سے زیادہ مدت بھی ہوگی۔ وہ کس طرح حاصل ہو؟

پروفیسر ...... اس کا جواب زمین سے نہیں ملے

گا ہمیں اب آسمان کی طرف دیکھنا چاہئے ...... تم نے شہاب ثاقب کا نام تو سنا ہو گا۔

حامد ...... جی ہاں ...... وہ جلتے ہوئے اور ٹوٹتے ہوئے ستارے جو اکثر نظر آتے ہیں۔

پروفیسر ...... ہاں وہی! یہ ستارے دراصل مادہ کے ٹکڑے ہیں۔ جو فضا میں بہت تیزی کے ساتھ حرکت میں رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ہماری زمین کی کشش میں آجاتے ہیں اور اپنی تیز رفتار اور ہوا کی رگڑ کی کے سبب جل اٹھتے ہیں بعض شہابیے چھوٹے اور بعض بہت بڑے بڑے بھی ہوتے ہیں۔

حامد ...... کیا یہ شہابیے بھی ہماری زمین کی چیزوں کی طرح کے ہوتے ہیں؟

پروفیسر ...... ہاں شہابیے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک پتھریلے دوسرے لوہے کے۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ شہابیے دراصل ایک سیارے کے ٹکڑے ہیں جو مریخ اور مشتری کے بیچ میں حرکت کرتا تھا۔ کسی وجہ سے یہ سیارہ ٹوٹ پھوٹ گیا اور اس کے ذرے اور ٹکڑے آج تک اسی مدار پر سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں اور کبھی کبھی دوسرے سیارے ان کو کھینچ لیتے ہیں۔ اور یہ شہاب ثاقب بن جاتے ہیں۔

حامد ...... آپ یہ عجیب بات بتا رہے ہیں وہ بے چارہ سیارہ ٹوٹ کس طرح گیا؟

پروفیسر ...... بھائی اس کا صحیح حال نہیں معلوم لیکن ہے یہ بات صحیح ...... شہابیوں کی جسمانی حالت اس خیال کو صحیح ثابت کرتی ہے کہ خود ہماری زمین کا اندرونی حصہ لوہے اور نکل کا بنا ہوا ہے۔ ہلکی چیزیں یعنی مٹی اور پتھر اوپر ہیں ہم جو تجربہ کرتے ہیں یا کوئی اور کام وہ سب اوپر کی مٹی پتھر اور عناصر سے کرتے ہیں اندر تک پہنچ پائیں تو ان سے بھی زمین کی عمر کا بہت صحیح اندازہ ہو سکتا ہے لیکن شہابیوں نے ہمیں اس کا موقع مہیا کر دیا ہے آہنی یعنی لوہے والے شہابیے دراصل اس برباد شدہ سیارے کے مرکزی حصے کے ٹکڑے ہیں ان کا امتحان کر کے ہم اس سیارے کی عمر معلوم کر سکتے ہیں۔

محمود ...... تو کیا معلوم ہوا؟

پروفیسر ...... جب آہنی شہابیوں کا امتحان لیا گیا تو ان کی عمر ساڑھے چار ارب سال نکلی۔ ظاہر ہے کہ جس طرح اور سیارے بنے ہیں اور جس زمانے میں بنے ہیں اسی زمانے میں ہماری زمین بھی وجود میں آئی تو یہ ساڑھے چار ارب سال کی مدت بھی دراصل ہماری زمین کی عمر کی انتہائی مدت ہوئی۔

محمود ...... گویا زمین کو پیدا ہوئے اب ساڑھے چار ارب سال ہوئے ہیں۔

پروفیسر ...... ہاں بالکل یہی بات ہے، لیکن صرف ارب کہہ دینے سے مدت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کچھ مثالیں بتاؤں تو تمہیں پتہ چلے گا۔

حامد ...... ضرور بتایئے۔

پروفیسر ...... ارب کا عدد اتنا بڑا عدد ہے کہ اگر

ربڑ کی دریافت

ربڑ کا استعمال ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ہر شخص کے گھر میں ربڑ کی بنی ہوئی اشیا موجود ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ پہلے پہل ربڑ کہاں دریافت ہوا۔ ربڑ ایک درخت کی چھال کے دودھ کو کہتے ہیں۔ اس درخت کا اصل وطن برازیل ہے۔ جہاں یہ جنگلی پودا تھا۔ وہاں کے قبائلی باشندے اس درخت کے دودھ کے استعمال سے ناواقف تھے۔ جب یورپ کے لوگ نئی بستیاں بسانے کے لئے براعظم امریکہ میں پہنچے تو انہوں نے اس درخت کے دودھ کے استعمال کرنے کا طریقہ سوچا۔

اس درخت کا دودھ حاصل کرنے کے لئے اس کے تنے میں چاقو سے ترچھے گھاؤ لگائے جاتے ہیں اور ان کے نیچے بالٹی رکھ دی جاتی ہے۔ جب ایک بالٹی بھر جاتی تو دوسری رکھ دی جاتی۔ یہی دودھ خشک ہو کر ربڑ بن جاتا۔ جب موٹر کاروں کا زمانہ آیا اور ان کے پہیوں کے لئے ٹائر اور ٹیوب کی ضرورت پڑی تو برازیل سے ربڑ کے پودے منگوا کر ملائیشیا اور انڈونیشیا میں بھی لگا دیئے گئے۔ آج ان ملکوں میں ربڑ کے درختوں کے فارم ہیں۔ اور وہاں سے کافی مقدار میں ربڑ حاصل کیا جاتا ہے۔

مرسلہ:۔ محمد اختر سردار۔ کسووال۔

لیے استعمال کرنا ہو تو پرانے واقعات سالوں میں نہیں بلکہ منٹوں میں بولے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ محمد بن قاسم کے حملے کو ابھی نصف ارب منٹ بھی نہیں ہوئے ہیں اور اہرام مصر کو بنے ہوئے کچھ اوپر دو ارب منٹ ہوئے ہیں۔

محمود ...... یہ واقعی بہت بڑی مدت ہے۔

پروفیسر ...... بہت بڑی ہے اس کا اندازہ تم کو اس سے ہو گا کہ اگر تم ایک، دو تین، چار، تیزی سے گننا شروع کر دو تو ساڑھے چار ارب کی گنتی تک پہنچتے پہنچتے تم کو چالیس برس لگ جائیں گے۔ اس کا امتحان بہت آسان ہے گھڑی اٹھا کر ایک دو تین .... سو تک گنو اور اس کا وقت دیکھ لو، پھر حساب لگا لو کو ساڑھے چار ارب کے پہنچتے پہنچتے کتنا وقت لگے گا۔

حامد ...... اللہ اکبر! انسان کی آدھی عمر گنتے گنتے ختم ہو جائے۔

پروفیسر ...... یہی بات ہے۔ خیال کرو کہ زمین کو پیدا ہوئے تو ساڑھے چار ارب سال ہو گئے۔ لیکن انسان کو پیدا ہوئے ابھی چند لاکھ سال سے زیادہ نہیں ہوئے ہیں۔ اور مہذب انسان کو وجود میں آئے ہوئے کل دس ہزار برس ہوئے ہیں۔ اور جسے سائنسی زمانہ کہتے ہیں تو اس کی مدت کل تین ساڑھے تین سو سال ہے۔ اگر ایک ہزار جلد کی کوئی ایسی کتاب ہو جس کی ہر جلد میں پانچ سو صفحے ہوں تو اس کے آخری ورق میں انسانی وجود کی داستان ہوگی۔ اور آخری چند سطروں میں انسانی تاریخ کی کہانی آجائے گی۔ اس سے پہلے کے باقی تمام ہزار صفحات اس زمین کی اس وقت کی تاریخ بتائیں گے۔ جب انسان یہاں نہیں تھا۔

محمد شاہد فیروز

تتلی

پھولوں پہ منڈلائے تتلی
گیت خوشی کے گائے تتلی
پیچھے بہت بھگائے تتلی
ہاتھ نہ پھر بھی آئے تتلی

کہتی ہے ترساؤں گی میں
یونہی ناز دکھاؤں گی میں
تم سے نہ گھبراؤں گی میں
تم کو خوب ستاؤں گی میں

میں تتلی ہوں رنگوں والی
نیلی پیلی بھوری کالی
گلشن گلشن اُڑنے والی
میرا گھر ہے ہر اک ڈالی

اسے پکڑنا چاہا میں نے
اسے جکڑنا چاہا میں نے
منت بھی کر ڈالی اس کی
لاکھ اکڑنا چاہا میں نے

ہر تدبیر ناکام ہوئی
مجھ سے نہ وہ رام ہوئی
اتنا بھاگا پیچھے اس کے
دن ڈوبا اور شام ہوئی

شام ڈھلے کھو جائے تتلی
پھولوں کی ہو جائے تتلی
پتوں کا پھر بستر لے کر
شاخوں پر سو جائے تتلی

وہ تو شام کو سو جاتی ہے
شاہد کو کب نیند آتی ہے

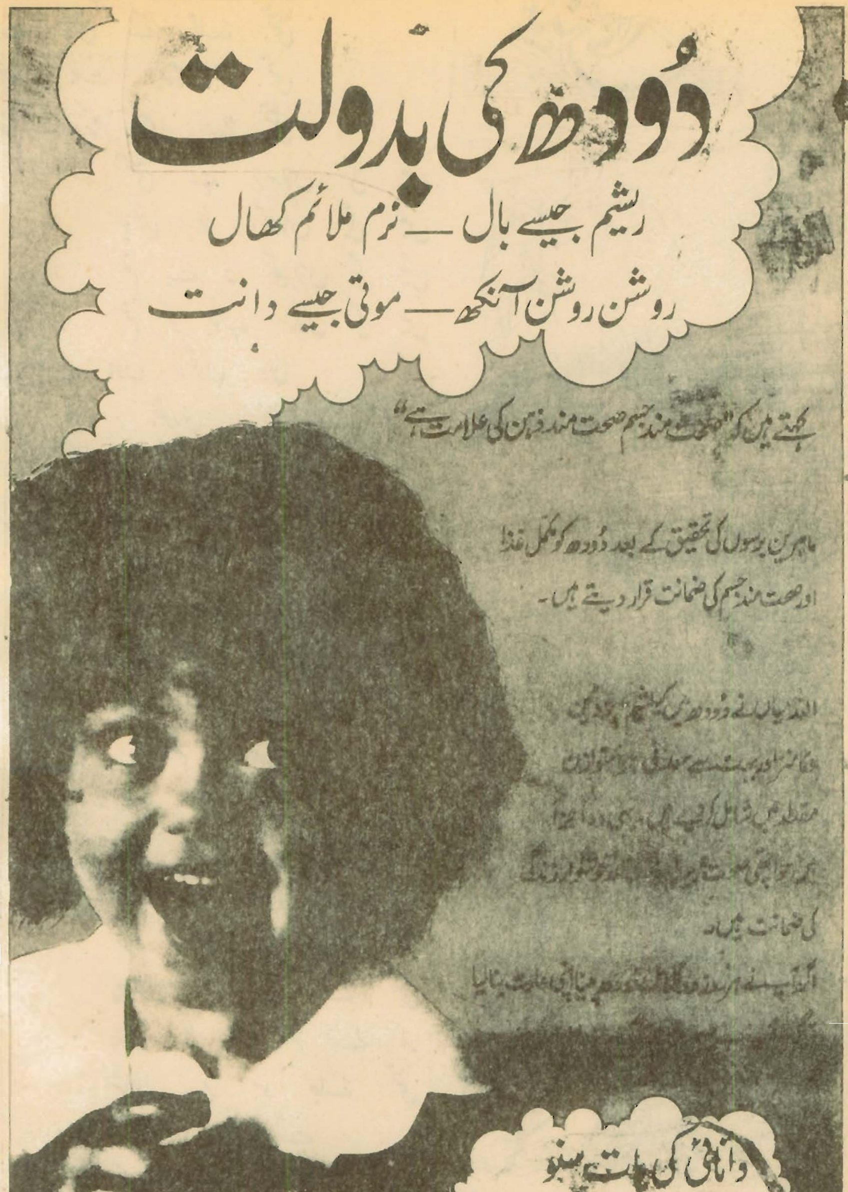

دودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
دانائی کی بات سنو
دودھ پیو — مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال

جھوٹ کا بدلہ جھوٹ

فرینک برا وعظی

دنیا کے تمام پرندوں میں کوئی اتنا سادہ لوح، شریف اور مسکین نہیں ہے، جتنی کہ فاختہ۔ اس کے تمام طور طریقے بڑے عاجزانہ اور شریفانہ ہیں۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ بدی اور شر کیا چیز ہیں؟

گیدڑ ایک مکار اور بدمعاش جانور ہے۔ عیاری اس پر ختم ہے۔

لیک روز فاختہ درخت کی شاخ پر بیٹھی اپنے ننھے ننھے تین بچوں کو چوم چاٹ رہی تھی۔ یہ سب اپنے گھونسے میں آرام و سکون سے رہتے تھے، جو تنکے چُن چُن کر بڑی مشکل سے بنایا گیا تھا۔ جس وقت گیدڑ کا وہاں سے گزر ہوا، اس وقت فاختہ اپنے معصوم بچوں کو میٹھے اور مدھم سروں میں گانا سنا رہی تھی۔ "کوکو...... کو...... کوکو...... کو......"

گانے کی آواز سن کر گیدڑ درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ فاختہ کو پہچان لینے کے بعد بولا۔ "آداب عرض ہے بھانجی جان! کیا ہو رہا ہے؟"

فاختہ بولی۔ "آداب ماموں جان!"

گیدڑ نے پوچھا۔ "یہ اوپر بیٹھی تم کیا کر رہی ہو۔ اور یہ کوکو کا مطلب کیا ہے؟"

فاختہ نے کہا۔ "مطلب وطلب کچھ نہیں ہے۔ بس ایک گانا ہے، بچوں کا دل خوش کرنے کا ایک بہانہ۔ تنکوں کے اس گھونسلے میں ان بے چاروں کو ملتا ہی کیا ہے سوائے کوکو کے۔"

گیدڑ شفقت سے بولا۔ "ایسا نہ کہو۔ بہت خوبصورت گانا ہے۔ خیر سے بچے کتنے ہیں؟"

فاختہ بولی۔ "اللہ کے دیئے، تین ہیں۔"

گیدڑ نے درخت کے چاروں طرف دو چار چکر لگائے، یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر وہ اسی جگہ پر آکر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ بھانجی فاختہ، میری چھوٹی بہن کی بٹی، تمہارا کنبہ تو بہت بڑا ہے۔ دو افراد سے زیادہ کا گھرانہ نہیں ہونا چاہیے۔ اپنا ایک بچہ میری طرف بھیج دو۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

فاختہ نے کہا۔ "میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تینوں بچے مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

گیدڑ غرانے لگا۔ "تم اپنے آپ کو شریف سمجھتی ہو..... شریف..... کیا شریف ایسے ہوتے ہیں جو اپنے تین ہٹے کٹے بچوں کے ساتھ ٹھٹھے لگا رہا ہو اور نیچے دوسرا بھوک سے مر رہا ہو۔ دیکھو میری پسلیوں کو دیکھو۔ بھوک سے اندر دھنس گئی ہیں۔" گیدڑ نے اپنا سانس اندر کی طرف کھینچ لیا، تاکہ پسلیاں پیٹ سے لگ جائیں۔

فاختہ نے کہا۔ "ماموں گیدڑ مجھے واقعی آپ کی حالت پر افسوس ہے۔ لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ اپنا بچہ میں آپ کو نہیں دوں گی۔ یہ میری جان کے ٹکڑے ہیں۔" گیدڑ رونے لگا۔ پھر اوپر کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ "فاختہ تم مزے سے اوپر بیٹھی ہو، تمہارے بچے کھیل رہے ہیں اور میں یہاں بھوک سے مر رہا ہوں۔" وہ اس طرح درد سے کراہنے لگا، جیسے واقعی مر رہا ہو۔

فاختہ نے کہا۔ "خدا کے لئے اپنی جگہ پر چلے جاؤ ماموں جان، اور جہاں سے روز کھایا کرتے ہو وہیں سے آج بھی کھاؤ۔"

اتنا سننا تھا کہ گیدڑ آگ بگولا ہو گیا۔ اٹھ کھڑا ہوا اور طیش میں بولا۔ "میں اپنی بھوک کی بپتا سنا رہا ہوں اور تو حقیر سی جان میری توہین کر رہی ہے۔ میں تجھ سے بڑی شرافت سے پیش آ رہا ہوں اور تو نخرے کئے چلے جا رہی ہے۔ میری برداشت کا مذاق نہ اڑا۔ تو اپنا ایک بچہ نیچے نہیں گرائے گی تو میں اوپر درخت پر چڑھ کر تیرے تینوں بچوں کو کھا لوں گا۔ تجھے بھی ہڑپ کر لوں گا، اور تیرا یہ تنکوں کا محل پاش پاش کر دوں گا۔"

گیدڑ کی بھپکی سے فاختہ ڈر گئی۔ اتنا ڈری کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ گیدڑ تو درخت پر چڑھ ہی نہیں سکتا۔ سو اس نے اپنے تینوں بچوں اور، اپنے آپ اور اپنے گھونسلے کو بچانے کے لئے اپنا ایک لخت جگر نیچے پھینک دیا۔

گیدڑ ایک ہی لقمے میں فاختہ کے بچے کو چٹ کر

گیا۔ پھر اس نے درخت کے چاروں طرف دو چکر لگائے، یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر وہ اسی جگہ پر آکر بیٹھ رہا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اچانک زور زور سے رونے لگا۔ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ زمین پر چت لیٹ کر، اور منہ آسمان کی طرف کر کے یوں بلبلانے لگا، جیسے مرنے والا ہو۔ پھر فاختہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میری بھانجی فاختہ، سچ بتاؤ، تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

فاختہ نے کہا۔ "دو...... صرف دو..... اب تو صرف دو۔"

گیدڑ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "ان میں سے ایک، فقط ایک مجھے دے دو۔ ورنہ میں مر جاؤں گا..... مر جاؤں گا۔ مجھے بچالو فاختہ، مجھے بچا لو۔"

فاختہ نے کہا۔ "کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم مر ہی جاتے۔ لیکن تم مرتے نہیں صرف مرنے کی باتیں کرتے ہو۔"

گیدڑ اشتعال میں آ گیا۔ "تو پھر توہین کر رہی ہے۔ تو نے میری بات کو بھلا دیا ہے یاد رکھ، اگر تو نے ایک بچہ نہیں گرایا تو میں اوپر درخت پر چڑھ کر تیرے دونوں بچوں کو کھالوں گا۔ تجھے بھی ہڑپ کر لوں گا اور تیرا یہ تنکوں کا محل بھی پاش پاش کر دوں گا۔"

فاختہ نے کہا۔ "نہیں ہرگز نہیں دو بچے ہائے صرف دو بچے!"

گیدڑ نے درخت کے چاروں طرف ایک چکر لگایا، یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر وہ اپنی جگہ پر واپس آیا اور اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اچھا فاختہ اب تو اپنے انجام کے لئے تیار ہو جا۔ میں اوپر آ رہا ہوں۔ تیرے دونوں بچوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے بھی ہڑپ کر جاؤں گا اور تیرا یہ گھونسلا تار تار کر کے نیچے پھینک دوں گا۔"

گیدڑ کی اس بھبکی سے فاختہ ڈر گئی۔ اتنا ڈری کہ اس نے اپنا دوسرا بچہ بھی نیچے پھینک دیا۔ گیدڑ اسے بھی ایک ہی لقمے میں ہڑپ کر گیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے درخت کے چاروں طرف ایک چکر لگایا، یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔

پھر اس نے اوپر فاختہ کی طرف دیکھا اور لجاجت سے بولا۔ "میری چھوٹی بہن کی بیٹی، میری بھانجی، میری مدد کرو۔ مجھے مرنے سے بچالو۔ اپنا ایک اور بچہ مجھے دے دو۔ ورنہ اس درخت کے نیچے تمہیں میری لاش ہی ملے گی۔ سچ بتاؤ تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

فاختہ دکھ سے بولی۔ "ایک صرف ایک...... فقط ایک..... اگر مرنا ہے تو بے شک مر جاؤ ایک دن سب کو مرنا ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ گیدڑ جلال میں آ گیا۔ "تو نے اب کے توہین کی حد کر دی ہے چھوکری۔

برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بس اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ میں اوپر آتا ہوں، تیرا بچہ بھی کھاؤں گا تجھے بھی کھاؤں گا اور تیرا محل اجاڑ دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے درخت کے تنے کی طرف جھپٹا، جیسے وہ اب درخت پر چڑھنے والا ہو۔

فاختہ گیدڑ کی اس بھپکی سے ڈر گئی۔ اتنا ڈری کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ گیدڑ تو درخت پر چڑھ ہی نہیں سکتا۔ سو اس نے اپنا آخری بچہ بھی موت کے منہ میں پھینک دیا۔

گیدڑ اسے بھی ایک ہی لقمے میں ہڑپ کر گیا۔ پھر اس نے درخت کے چاروں طرف ایک چکر لگایا یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر اس نے اپنی راہ لی۔

تھوڑی دیر پہلے جو فاختہ خوشیوں بھرا گیت گا رہی تھی۔ "کوکو ...... کو" اب وہی فاختہ اپنے سونے گھر کو دیکھ کر بین کر رہی تھی "ہاہا...... ہا" جس وقت وہ آہوں اور سسکیوں کے ساتھ واویلا کر رہی تھی عین اس وقت ایک ہنس کا ادھر سے گزر ہوا۔ ہنس نے کسی کے بین کرنے کی دکھ بھری آواز سنی تو وہ درخت کے نیچے آگیا۔ اوپر کی طرف دیکھا۔ فاختہ کو پہچان کر بولا۔ "میری چھوٹی بہن یہ بین کیوں، یہ ماتم کیسا؟ تم اتنی دکھی کیوں ہو؟"

فاختہ سے غم کے مارے بولا بھی نہ جا رہا تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ "آہ ...... ہائے۔" پھر ضبط کر کے بولی۔ "ہائے ...... کیا بتاؤں ...... آہ ...... کیسے بتاؤں ...... یہاں وہ کم بخت گیدڑ آیا تھا ...... ہائے ...... اس نے کہا، ایک بچہ پھینک دو بتاؤ میں کیسے پھینک دیتی اپنے بچے ...... لیکن وہ دھمکیاں دینے لگا کہ میں سب کو کھا جاؤں گا...... میں نے اس کی دھمکی میں آ کر ایک بچہ پھینک دیا ...... اس نے پھر دھمکی دی ...... آہ میں نے اپنا دوسرا بچہ پھینک دیا ...... ہائے ...... اس نے پھر دھمکی دی، میں نے اپنا تیسرا بچہ بھی پھینک دیا...... ہائے میں کیا کروں ...... میں جنم جلی اکیلی رہ گئی...... ہائے میرے پیارے پیارے بچے!"

ہنس دیر تک خاموش کھڑا، اس شاخ کو غور سے دیکھتا رہا، جس پر فاختہ بیٹھی بین کر رہی تھی۔ پھر وہ درخت کے نیچے ٹہلنے لگا، جیسے کچھ سوچ رہا ہو، پھر وہ عین اس شاخ کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا جس پر فاختہ بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی لمبی گردن اوپر اٹھالی۔ ایک آنکھ شاخ پر تھی اور دوسری آنکھ زمین پر۔ اس نے اپنے نیچے گرے ہوئے بازو اوپر اٹھائے اور اپنے جسم پر رکھ لئے، اور پھر ایک ٹانگ اٹھا کر اپنے پروں میں چھپالی۔ اب فلسفیوں کی طرح گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر جیسے کوئی خیال چمکا ہو۔ اس نے فاختہ سے کہا۔ "چھوٹی بہن، مجھے تمہاری رام کہانی سن کر بہت قلق ہوا۔

لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ جب تم اور تمہارے بچے اپنے گھونسلے میں بحفاظت بیٹھے ہوئے تھے تو یہ ہوا کیوں؟ تمہیں یہ کس نے بتایا کہ گیدڑ درخت پر چڑھ سکتا ہے۔"

فاختہ نے جواب دیا "...... ہائے ...... ہائے ...... مجھے یہ خود گیدڑ نما رذیل نے بتایا ...... اس نے مجھے اتنا ڈرایا، اتنی دھمکیاں دیں، اتنا خوف زدہ کیا کہ میں بھول ہی گئی کہ وہ درخت پر چڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ...... ہائے میں کیسی بےوقوف تھی...... یہ سب کچھ میری اپنی حماقت سے ہوا...... ہائے میں کیا کروں؟"

ہنس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "بہن، صرف تمہاری حماقت کی وجہ سے نہیں۔ تمہاری شرافت اور سادہ لوحی کی وجہ سے بھی۔ کسی کو اتنا شریف اور سادہ لوح نہیں ہونا چاہئے۔ بہر حال گیدڑ میرے ہتے چڑھ گیا تو اسے وہ مزا چکھاؤں گا کہ یاد کرے گا۔"

یہ کہہ کر ہنس مڑا اور لمبے لمبے ڈگ سے جانے لگا۔ اس نے پھر اپنے پروں کو جسم پر اس طرح پھیلا لیا، جس طرح ہنس چلتے وقت پھیلایا کرتے ہیں۔ اچانک اس کے چلنے کی رفتار آہستہ ہو گئی جیسے وہ کسی گہری سوچ میں پڑا ہوا ہو۔ قریب کی جھاڑیوں سے سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی تو وہ چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنے پروں پھلا لئے کہ اگر کوئی ناگہانی آفت آئی تو وہ فضا میں پرواز کر جائے۔ دیکھا کہ یہ تو گیدڑ ہے، اور گیدڑ سے بھلا کیا ڈرنا۔ جس کے پاس تو نہ کوئی سچائی ہے، نہ کوئی نیکی، وہ تو سخت بزدل ہوتا ہے، اور بزدل مکار ہوتا ہے، کیونکہ مکار بزدل ہوتا ہے۔ اس نے پھولے ہوئے پر اپنے جسم پر اطمینان سے سمیٹ لئے۔ گیدڑ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت دور سے ہانپتا کانپتا دوڑتا آ رہا ہو۔ اس کی زبان لٹکی ہوئی تھی اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔

ہنس سکون سے خاموش کھڑا رہا۔ اس نے اپنی گردن اوپر اٹھالی، یوں کہ اس کی ایک آنکھ اوپر کی طرف دیکھ رہی تھی اور دوسری آنکھ گیدڑ پر جمی ہوئی تھی۔

گیدڑ اس جمی ہوئی آنکھ سے کسی قدر سراسیمہ ہو گیا۔ "آداب بجا لاتا ہوں دادا جان! آپ سے یوں اچانک مل کر بہت خوشی ہوئی۔" اس نے اپنی زبان منہ میں کر لی، لیکن سانس آرام سے لینے کے لئے باہر نکال دی۔ پھر جھاڑیوں کی طرف کھسکنے لگا۔

ہنس نے اس کی طرف پر معنی نگاہ سے دیکھا اور کہا۔ "برخوردار، ایسا کونسا دور دراز کا سفر طے کر کے آئے ہو کہ اس طرح ہانپ رہے ہو؟"

گیدڑ نے اپنی زبان پھر منہ میں کر لی۔ لیکن جھوٹ کے پاؤں کہاں، اس کی زبان پھر خود بخود باہر نکل آئی اور سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

"ہائے ہائے ...... میری ایک بیوی ہے۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں بہت دور پہاڑوں میں رہتا ہوں...... ہائے ہائے ...... میرا ایک بچہ بیمار ہے۔ اس کے لئے پرہیزی کھانا لینے نکلا ہوں...... اس کے لئے خوراک ڈھونڈتے ڈھونڈتے اتنی دور نکل آیا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ پاؤں میں چھالے

پڑ گئے ہیں۔ ہائے ہائے...... لیکن دادا جان میں دیکھ رہا ہوں، آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ طوفان آنے والا ہے۔"

ہنس نے کہا۔ "ہاں تمہیں فوراً پہنچ جانا چاہئے۔ لیکن تم زمین پر ٹانگوں سے چلنے والے لوگ بہت سست ہوتے ہو۔ ہم پرندے اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہیں۔ فاصلے ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔"

گیدڑ نے اپنا لب و لہجہ فوراً نرم اور خوشامدانہ کر لیا۔ "بے شک، تم لمبے پروں والے ہم چھوٹی ٹانگوں والوں کے لئے قابل رشک ہو۔ میں ہمیشہ ہی سے ان پرندہ لوگوں سے حسد کرتا ہوں۔"

ہنس نے کہا۔ "ارے بھئی اس میں حسد کرنے کی کیا بات ہے۔ کل صبح اسی وقت اسی جگہ تم پہنچ جانا، جس طرح میں نے اپنے بچوں کو اڑنا سکھایا ہے، تمہیں بھی سکھا دوں گا۔"

گیدڑ نے شکریہ ادا کیا اور جنگل میں گھس گیا۔

دوسرے روز اسی جگہ مقررہ وقت پر ہنس اور گیدڑ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ گیدڑ ایک گنجان جھاڑی کے پاس کھڑا رہا، اور ہنس کبھی لمبے لمبے اور کبھی چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرتا ہوا چہل قدمی کرنے لگا۔ پھر جیسے کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "گیدڑ میاں اگر تم واقعی اڑنا سیکھنا چاہتے ہو، یعنی سچے دل سے تو پھر جیسا کہتا ہوں ویسا کرتے جاؤ۔"

گیدڑ نے کہا۔ "آپ میرے مرشد، میں آپ کا مرید۔ جیسا حضور فرمائیں گے۔ ویسا ہی کروں گا۔"

ہنس نے کہا۔ "تو سامنے وہ گوندی کا درخت دیکھ رہے ہو نا، جس میں گوند رس رہا ہے۔ درخت پر جاؤ اور اپنا جسم اس سے اتنا رگڑو کہ تمہارے ایک ایک بال پر گوند چپک جائے۔"

گیدڑ اس درخت تک گیا اور اپنا جسم درخت سے رگڑ کر گوند سے چکنا کر لیا۔ واپس آکر ہنس سے کہا۔ "یہ اڑنے کی تربیت تو بہت مہنگی پڑی۔ سارے بال چپک گئے۔"

ہنس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ چپ چاپ اپنے بدن سے پر نوچنے لگا اور... ایک ایک پر گیدڑ کے گوند والے جسم سے چپکانے لگا، حتیٰ کہ گیدڑ کے پورے جسم پر، پر لگ گئے اور وہ دنیا کی کوئی اور ہی مخلوق نظر آنے لگا۔ پھر ہنس نے شرارت سے ایک لمبا پر اپنی دم سے اکھاڑا اور گیدڑ کی دم پر ٹانک دیا۔

گیدڑ نے اپنے اوپر نگاہ کی تو اسے بہت اچھا لگا۔ وہ خوش ہوا، اترایا، اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو کر اچھلنے لگا اور اگلے پیر اٹھا کر تالیاں بجانے لگا۔ "اوہو جی میں تو پرندہ بن گیا۔ اب بڑے بڑے فاصلے پلک جھپکتے میں طے کر لیا کروں گا۔"

گیدڑ نے اڑنے کی کوشش کی، مگر اڑ نہ سکا۔ وہ ہنس کے پاس گیا اور بولا۔

"استاد ہونا۔ ایک گُر اپنے پاس رکھ لیا۔ مجھے پرندہ تو پورا بنا دیا، لیکن اڑنا نہ آیا، استاد وہ گُر کیا

ہے؟"

ہنس نے کہا۔ "ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ وہ گر بھی بتا دوں گا۔ تم میرے بچوں کے برابر ہو، اور جس طرح میں نے اپنے بچوں کو اڑنا سکھایا ہے اسی طرح تمہیں سکھاؤں گا۔ تم یوں کرو کہ میری پیٹھ پر چڑھ کر بیٹھ جاؤ۔ پھر میں تمہیں فضا میں لے کر جاؤں گا جہاں سے تمہیں اڑنا آ جائے گا۔ اسی طریقے سے میں نے اپنے بچوں کو بھی اڑنا سکھایا ہے۔"

گیدڑ نے کچھ بھی نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ بے بسی سے پہلے آسمان کی طرف دیکھا پھر ہنس کی طرف پھر آسمان کی طرف پھر ہنس کی طرف۔

ہنس نے کہا "اگر تم مجھے یوں توہین آمیز نظروں سے دیکھو گے تو میں تمہیں اڑنا نہیں سکھاؤں گا۔"

گیدڑ نے گڑگڑا کر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "نہیں سرکار۔ آپ تو میرے مرشد ہیں۔ میں آپ کی توہین کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تو اندازہ کر رہا تھا کہ آسمان یہاں سے کتنی دور ہے اور آپ کتنی دور لے جا کر مجھے فضا میں چھوڑیں گے۔"

بہر صورت گیدڑ ہنس کی پیٹھ پر مضبوطی سے بیٹھ گیا۔ ہنس نے اپنے پر پھیلائے اور فضا میں اڑا بلند سے بلند تر ہو گیا۔ فضا کی وسعتوں میں اعلیٰ بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اس نے گیدڑ سے کہا۔ "گیدڑ میاں اب اڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

گیدڑ نے نیچے زمین پر دیکھا۔ کسان عورتیں جو کھیتوں میں درانتیوں سے فصل کاٹ رہی تھیں اسے اوپر سے بالکل چیونٹیاں سی نظر آ رہی تھیں۔

ہنس نے کہا۔ "جونہی میں کہوں گا اڑو، تم فوراً اپنی ٹانگیں کھول کر فضا میں چھلانگ لگا دینا اور اپنے پروں سے اڑنا شروع کر دینا۔ اچھا اب اڑو۔" یہ کہتے ہی ہنس گیدڑ کے نیچے سے نکل گیا اور گیدڑ فضا میں یوں ٹانگیں چلانے لگا کہ اسے شروع میں محسوس ہوا جیسے وہ اڑ رہا ہے...... لیکن ہوا کے زور سے اس کے جسم سے پر نکل نکل کر فضا میں اڑ رہے تھے۔ صرف پر اڑ رہے تھے اور گیدڑ تیزی سے زمین کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بے قابو ہو کر نیچے گر رہا ہے تو اس نے وہیں سے شور مچانا شروع کر دیا۔ "اپنی دارنتیاں ہٹا لو اپنے کھرپے ہٹالو۔"

عورتوں نے یہ ہولناک منظر دیکھا کہ ایک چار ٹانگوں والی مخلوق اڑتے ہوئے پروں میں گھری ہوئی زمین کی طرف تیزی سے کھنچی چلی آ رہی ہے، تو وہ اپنی اپنی دارنتیاں وہیں چھوڑ کر خوف زدہ ہو کر بھاگ گئیں۔

گیدڑ عین درانتیوں کے اوپر گرا۔ اس کا جسم لہولہان ہو گیا اور وہ اسی وقت چل بسا!!!

ظلم کرنے والے ظالموں کو اپنے کئے کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے!!!

نوٹس بورڈ

اگر آپ آنکھ مچولی میں لکھتے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں تو درج ذیل باتیں ضرور پڑھ لیجئے۔

آنکھ مچولی میں تمام تحریریں اپنے معیار کے مطابق نمبر آنے پر شائع ہوتی ہیں۔

آنکھ مچولی میں (سوائے "قلم قتلے" کے) تمام شائع ہونے والی تخلیقات کا معاوضہ دیا جاتا ہے

نقل شدہ تحریروں، انتخاب، اقوال وغیرہ کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

آپ تحریریں بھجوانے سے قبل یہ اطمینان ضرور کر لیں کہ آپ کی ہر تحریر کے پیچھے آپ کا نام اور پتہ صاف صاف لکھا ہوا ہے۔

ایک کاغذ پر دو مختلف نوعیت کی تحریریں قابلِ قبول نہ ہوں گی۔

اپنی تحریروں کے بارے میں یا کچھ اور جاننے کے لئے جوابی لفافہ ضرور بھجوائیں۔

ماہ نامہ آنکھ مچولی 1-پی آئی بی کالونی، کراچی

روشنی

زندگی کے میلے میں

اویس یوسف زئی، اٹک

بچپن میں شیخ سعدی شیرازیؒ اپنے باپ کی انگلی پکڑے کسی میلے میں جا رہے تھے۔ راستے میں کسی جگہ بندر بندریا کا کھیل دیکھنے میں ایسے لگے کہ باپ کی اُنگلی چھوٹ گئی۔ باپ تو اپنے دوستوں کے ساتھ آگے نکل گئے اور سعدی تماشہ دیکھتے رہے۔ جب تماشا ختم ہوا تو باپ کو سامنے نہ پا کر بے اختیار رونے لگے۔ آخر اللہ اللہ کر کے باپ بھی ڈھونڈتے ہوئے آ نکلے۔ سعدی کو روتا دیکھ کر ان کے سر پر ہلکی سی چپت ماری اور کہا۔

"نادان بچے وہ بے وقوف جو بزرگوں کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح روتے ہیں۔"

سعدیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا تو دنیا کو ایسے ہی پایا، ایک میلے کی طرح۔ آدمی اس میلے میں مجھ جیسے نادان بچوں کی طرح ان بزرگوں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے جو اچھے اخلاق سکھاتے ہیں اور دین کی باتیں بتاتے ہیں۔ تب اچانک اسے دھیان آتا ہے کہ زندگی غفلت میں گزر گئی، پھر روتا ہے اور پچھتاتا ہے۔ لیکن پھر رونا دھونا کام نہیں آتا۔

خدا سچا ہے

فاطمہ قریشی، پشاور

حال ہی میں امریکہ کے سائنس دانوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ نہانے سے یعنی منہ ہاتھ اور پاؤں دھونے سے بے شمار چھوٹی چھوٹی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں اور جسم کی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے جس سے انسان تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہے اس لئے وہ ہر ایک مریض کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ وہ دن میں پانچ مرتبہ ضرور نہائیں۔ جناب! آپ کو تو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہزاروں سال پہلے دن میں پانچ مرتبہ وضو کرنے کا حکم دیا تھا اور امریکی سائنس دانوں کو یہ بات اب معلوم ہوئی ہے۔

غیر ملکی سائنس دان خاص طور پر امریکی سائنس دان اس بات پر حیران ہیں کہ مسلمانوں میں ایڈز کی تعداد ایک فی صد سے بھی کم ہے انہوں نے قرآن مجید کے ترجمے سے معلوم کیا کہ مسلمانوں پر سور گدھے اور کتوں وغیرہ کا گوشت حرام ہے چنانچہ انہوں نے جب سور کے گوشت پر ریسرچ کی تو یہ بات سامنے آئی کہ سور کے گوشت میں ایسے جراثیم

پائے جاتے ہیں جو ایڈز پھیلاتے ہیں۔ لہٰذا اب وہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح سور کے گوشت پر پابندی لگ جائے۔ حدیث ہے کہ "کتے کے جھوٹے ...... برتن کو اگر سات مرتبہ دھویا جائے تو اس سے برتن صاف ہو جاتا ہے۔" اس حدیث کو مد نظر رکھتے ہوئے جب امریکی سائنس دانوں نے اس پر ریسرچ کی تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہاں کتے کے جھوٹے ...... برتن کو اگر سات مرتبہ دھویا جائے تو برتن میں موجود جراثیم ختم ہو جاتے ہیں۔

نیز قرآن مجید میں ہے کہ "اگر وضو کے لئے پانی نہ ملے تو مٹی سے تیمّم کرو۔"

پہلے پہل تو امریکی سائنس دانوں نے اسے غلط قرار دیا کہ مٹی سے تو ہاتھ پاؤں اور بھی گندے ہو جاتے ہیں لیکن جب انہوں نے مٹی پر تجربے کئے تو حیرت انگیز طور پر یہ بات سامنے آئی کہ مٹی میں کچھ ایسے کیمیائی اجزا موجود ہیں جس سے جسم کے علاوہ گندے برتن اور دوسری چیزیں بھی صاف ہو سکتی ہیں۔

امریکہ میں آپ ایک ہسپتال میں جائیں وہاں پر ایک بورڈ لگا ہو گا جس پر لکھا ہو گا کہ ہم ہر مریض کو بچانے کے لئے بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن اس وقت جو اثر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے کا ہوتا ہے وہ کسی بھی علاج میں نہیں ہوتا ہے۔ کئی امریکی ڈاکٹر و سائنس دان قرآن مجید پر ریسرچ کرتے ہوئے مسلمان ہو چکے ہیں وہ کہتے ہے کہ "ہم نے اس با

برکت کتاب میں جو بات بھی پڑھی وہ سچائی سے بھرپور تھی اور جس مذہب کی کتاب کا یہ عالم ہے تو اس مذہب کے کیا کہنے ۔ اس مذہب کے علاوہ اور کوئی مذہب ہمیں اپنی طرف راغب نہ کر سکا لہٰذا ہم نے اسلام قبول کیا۔"

کتاب کہتی ہے کہ ......

میں تیری مہربان دوست اور ہمدرد ساتھی ہوں۔ میں ایک ہنر مند دوست ہوں۔ میں تیری خوشیوں کو پائیدار بناتی ہوں اور غموں میں جرأت و ہمّت پیدا کرتی اور غمگساری کا کام کرتی ہوں۔

خوش بیان ہوں، باتیں بہت کرتی ہوں، اگرچہ بے زبان ہوں۔ میں تیری مشکلیں آسان کرتی ہوں لیکن تصیحتیں بہت کرتی ہوں کیونکہ تیری خیر خواہ ہوں۔

علم میری کُنجی ہے۔ میں ہر قوم کی روح ہوں اور علم کا گہرا سمندر ہوں۔

مرسلہ...... صائمہ ارم، واہ کینٹ۔

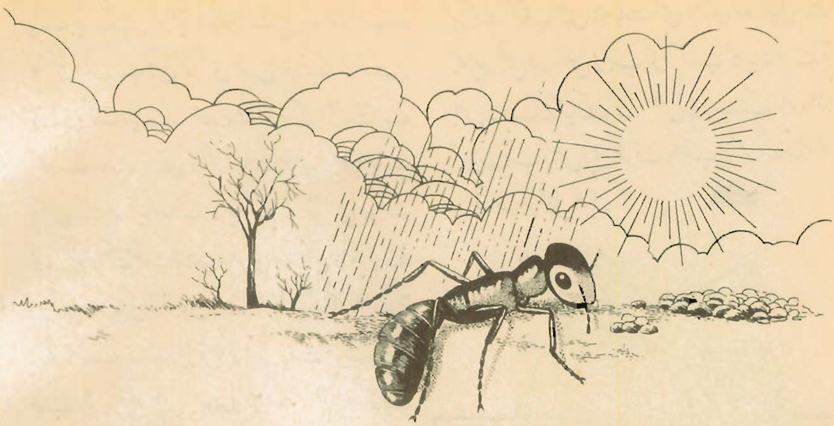

سب سے طاقتور

عائشہ قریشی، واہ کینٹ

بہت زمانہ گزرا جب زمین نئی نئی تھی۔ ایک ننھی سی چیونٹی برف سے ڈھکے ایک میدان میں گئی۔ برف پر چلنا مشکل تھا۔ اس نے برف سے کہا۔ "اے برف! میرے پاؤں تم پر اٹھ نہیں پاتے۔ اس حال میں چلنا کٹھن ہے۔ تم بہت طاقت ور ہو۔"

برف کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے کہا۔

"میں طاقت ور تو ہوں۔ لیکن دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور لوگ ہیں۔ سورج مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ جب سورج چمکتا ہے تو میں پگھل جاتی ہوں!"

یہ سن کر چیونٹی سورج کے پاس گئی، بولی۔ "اے سورج! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم چاہو تو ایک پل میں میرے پاؤں سے لپٹی ساری برف پگھلا دو۔"

سورج نے کہا۔ "ہاں میں طاقت ور ہوں۔ لیکن دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور لوگ موجود ہیں۔ بادل مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر بادل میرے سامنے آ جائے تو میں چھپ جاتا ہوں اور مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔"

اب چیونٹی بادل کے پاس گئی، بولی۔ "اے بادل! تم اتنے طاقت ور ہو کہ سورج

کو بھی چُھپا سکتے ہو جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ تم دنیا میں بہت طاقت ور ہو۔"

بادل نے کہا۔ "میں طاقت ور ہوں لیکن مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور آندھی ہے آندھی چاہے تو مجھے اڑا کر لے جائے۔"

اب چیونٹی آندھی کے پاس گئی۔ بولی۔ "اے آندھی! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم چاہو تو بادل کو اُڑا لے جاؤ جو سورج کو چُھپا سکتا ہے۔ سورج جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ تم سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔"

آندھی نے کہا۔ "ہاں! میں طاقت ور تو ہوں، لیکن دیوار مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ میں اس سے لاکھ سر ٹکراؤں، اس کا کچھ نہیں بگڑتا، وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دیوار مجھے توڑ کر رکھ دیتی ہے۔"

اب چیونٹی دیوار کے پاس گئی کہا۔ "اے دیوار! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم آندھی کا زور توڑ سکتی ہے۔ جو بادل کو اُڑا لے جاتی ہے۔ بادل جو سورج کو چھپا لیتا ہے۔ سورج جو میرے پاؤں سے لپٹی برف پگھلا سکتا ہے۔"

دیوار نے کہا۔ "ہاں اے چیونٹی! میں طاقت ور ہوں لیکن مجھ سے زیادہ طاقت ور تو چوہا ہے۔ چوہا اپنے دانتوں سے کُتر کُتر کر مجھ میں سوراخ کر دیتا ہے۔ میں اسے روک نہیں پاتی وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔"

اب چیونٹی چوہے کے پاس گئی، بولی۔ "اے چوہے! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم دیوار میں سوراخ کر سکتے ہو جو آندھی کا زور توڑ دیتی ہے۔ آندھی جو بادلوں کو اُڑا کر لے جاتی ہے۔ بادل جو سورج کو ڈھک لیتا ہے۔ سورج جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتی ہے۔ تم بہت طاقت ور ہو۔"

چوہے نے کہا۔ "میں طاقت ور ہوں لیکن مجھ سے زیادہ طاقت ور بلّی ہے"۔ چیونٹی اب بلّی کے پاس گئی اور بولی "تم بہت طاقت ور ہو۔ تم چوہے کو ہڑپ کر سکتی ہو۔ جو دیوار میں سوراخ کر سکتا ہے۔ دیوار جو آندھی کا زور توڑ سکتی ہے۔ آندھی جو بادل کو اُڑا لے جاتی ہے۔ بادل جو سورج کو ڈھک سکتا ہے۔ سورج جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ برف جو مجھے ٹھیک سے چلنے نہیں دیتی۔"

بلّی نے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ میں طاقت ور ہوں۔ لیکن شیر مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ جو مجھے چیر پھاڑ سکتا ہے۔"

اب چیونٹی شیر کے پاس گئی، بولی۔ "اے شیر! تم سب سے طاقت ور ہو"۔

شیر نے کہا۔ "میں بہت طاقت ور ہوں۔ لیکن انسان مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ میرا شکار بھی کر سکتا ہے۔"

اب چیونٹی انسان کے پاس گئی اور بولی۔ "اے انسان! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم شیر کا

شکار کر سکتے ہو جو سب کچھ کر سکتا ہے۔"
انسان نے کہا۔ "میں بہت طاقت ور ہوں لیکن سب سے زیادہ طاقت ور اللہ ہے جس نے مجھے بنایا ہے اور تمہیں بنایا ہے بلکہ سب کو بنایا ہے۔" چیونٹی یہ سن کر بہت شرمندہ ہوئی۔
آدمی دنیا کو سب کچھ سمجھنے لگے تو پھر اللہ کو بھول جاتا ہے......!!

میرا نام کلاشن ہے

محمد شاہد، کراچی

ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں .... تڑتڑتڑتڑتڑتڑ!!
ارے! ڈریئے نہیں...... میں آپ کی دوست "کلاشن" ہوں......
میرے موجد کا نام میخائل کلاشن کوف ہے جن کا تعلق ملک روس سے ہے۔ میخائل آج کل سخت بدحالی کا شکار ہے...... بدحالی کا شکار تو خیر روس بھی ہے۔ روس جسے طاقت، جبر، زبردستی کے ذریعے انسانوں پر حکومت کرنے کا شوق تھا...... روس کے ٹوٹنے بکھرنے کے بعد اب یہ بھوت امریکہ پر چڑھا ہوا ہے اب وہ پوری دنیا پر اپنا "نیو ورلڈ آرڈر" نافذ کرنا چاہتا ہے...... میں اپنی "نال" سے آنے والا امریکی وقت دیکھ رہی ہوں جس میں جب بھوت اترے گا تو امریکہ کا وہی حشر ہو گا، جو روس کا ہوا ہے۔ "تڑتڑتڑ...... تڑتڑ!" ڈریئے نہیں مجھے امریکہ پر غصہ آ گیا تھا جو ہمارے ملک میں ڈالروں کا سیلاب لانے کے سبز باغات دکھا رہا ہے...... چلیں چھوڑیں...... ہاں تو میں واپس اپنی کہانی کی طرف آتی ہوں۔ ۱۹۸۲ء میں میری شادی کابل (افغانستان) میں راکٹ لانچر سے ہوئی۔ میرے دو بچے بھی ہیں "ٹی ٹی" اور "ری پیٹر"......
افسوس! سیاسی پارٹیوں، سرمایہ داروں،

جاگیرداروں، ڈاکو لٹیروں نے مجھے اور میرے معصوم بچوں کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے...... گلی گلی محلّے محلّے میں ہم بدنام ہو رہے ہیں۔ لوگ ہم سے نفرت کرنے لگے ہیں...... جب لوگ نفرت سے ہمارا نام لیتے ہیں تو مجھے بے حد دُکھ ہوتا ہے...... اصل میں ہمارا کام لوگوں کی حفاظت اور ملک و ملّت کی نگہبانی کا تھا مگر چند ناعاقبت اندیشوں نے ہمیں غلط ہاتھوں میں پکڑا دیا ہے۔

میری رُسوائی کے افسانے ہر خاص و عام میں عام ہیں...... یہ بربادیوں کے افسانے آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔

میں خود اس رُسوائی اور ذلّت کی زندگی سے عاجز آ چکی ہوں۔ میری تو خواہش ہے کہ کوئی خدا کا بندہ ایسا ہو جو چوروں، ڈاکوؤں، اور قاتلوں کے ہاتھ سے مجھے چھُڑائے اور ان ہاتھوں میں تھمائے جو لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کرنا جانتے ہوں، جو انسانوں سے محبت کرتے ہوں۔

مجھے یقین ہے وہ وقت ضرور آئے گا جب مجھے بے گناہ انسانوں کو مارنے کے لئے نہیں بلکہ ان کی جان و مال کی حفاظت کے لئے اُٹھایا جائے گا!!!

سردی کی ہے بات نرالی

منور احمد صدیقی، کراچی

ماہ دسمبر آیا ہے
موسم سرما لایا ہے
فر فر ہوا چلی ہے اب
کانپ رہے ہیں تھر تھر سب
دانت بج رہے ہیں اب سب کے
چیزوں سے سردی ٹپکے
مونگ پھلی لے آتے ہیں
یا چلغوزے کھاتے ہیں
راتیں لمبی دن چھوٹے
راتوں رات پڑھا کیجئے
سڑکیں رہتی ہیں ویران
سردی نے کی ہیں سُنسان
سردی لگنے والی ہے
اس کی بات نرالی ہے

ایک چڑیا کی شادی تھی

مرسلہ..... عارف حسین، سکھر

ایک چڑیا کی شادی تھی
کوا جس کا ماموں تھا
بھالو جس کا خالو تھا
کوئل جس کی دادی تھی
ایک چڑیا کی شادی تھی

توتے بینڈ بجاتے تھے
چوہے ڈانس دکھاتے تھے
بُلبُل گانا گاتی تھی

ایک چڑیا کی شادی تھی
جنگل میں وہ رونق تھی
شہروں کو شرماتی تھی
ایک چڑیا کی شادی تھی

لوٹ پیچھے کی طرف

ہما عظمت، کراچی

ڈھول کی آواز سے ساجد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ننگی زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ زمین ٹھنڈی تھی اور اسے سردی لگ رہی تھی۔ جس جگہ وہ لیٹا تھا وہاں خاصا اندھیرا تھا پھر آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹنے لگا اور ڈھول کی آواز قریب آنے لگی۔

آواز بہت زیادہ تیز ہو گئی تو ساجد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسی وقت دو سوکھے سڑے سے ڈھانچے ناچتے گاتے، اچھلتے کودتے اس کے قریب چلے آئے۔ ایک ڈھول بجا رہا تھا جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں باجا تھا۔ وہ ناچ رہے تھے اور گا رہے تھے۔

"بدی نہ کرنا یارو ...... پچھتاؤ گے ساری لائف"

ناچتے ناچتے انہوں نے ساجد کو بھی اٹھا کر کھڑا

کر دیا اور اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے بھی نچانے لگے پس منظر میں کچھ ڈھانچے بڑی تیز میوزک بجا رہے تھے جس پر دونوں ڈھانچے تھرک رہے تھے۔ ناچتے ناچتے ساجد نے اپنے جسم پر نگاہ دوڑائی تو خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ خود ایک ڈھانچہ بن چکا ہے اسی وقت اس کی ٹانگ میں کسی چیز نے بڑے زور سے کاٹا۔ "اف مر گیا۔" تکلیف سے ساجد کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس نے دیکھا اس کی پیٹھ میں ایک زہریلا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ کئی اور سانپ ناچنے گانے والے ڈھانچوں کی ٹانگوں اور ہاتھوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ساجد نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ڈھانچے خوشی سے نہیں بلکہ تکلیف کے عالم میں ناچ اور گا رہے ہیں ...... ساجد کو یاد آیا کہ وہ دوسری دُنیا میں ہے۔ اس کا اسکوٹر ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا گیا تھا اور وہ وہیں سڑک پر مر گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ اس وقت قبر میں تھا۔

ساجد کو بھی ناچنے گانے کا بے حد شوق تھا۔ ساڑھے نو بجے ٹی وی پر خبرنامے کے بعد ناچ گانوں کا ایک پروگرام آتا تھا جس میں لڑکے لڑکیاں ناچتے گاتے تھے اور گھروں میں ٹی وی پر چھوٹے بڑے بچے اس پروگرام کو بڑے شوق سے دیکھتے تھے جب یہ پروگرام آتا تھا تو خود ساجد ٹی وی کے سامنے چپک کر بیٹھتا تھا۔ اس پروگرام کو دیکھ کر اسے بھی ناچنے گانے کا شوق چڑھ آیا تھا اور اس نے کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر ناچنا گانا شروع کیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ کی عبادت کا وقت ہوتا تھا تو تب بھی وہ اور اس کے دوست ناچتے گاتے تھے اور اب جب کہ وہ اچانک مر گیا تھا تو اسے پتا چل رہا تھا کہ مرنے کے بعد ان ناچنے گانے والوں کا کیا انجام ہونا ہے۔ "اف مر گیا ہائے مر گیا اف بچاؤ............" ڈھانچے بری طرح چلا رہے تھے ساجد بھی چیخ رہا تھا زہریلے سانپ اسے بھی بری طرح کاٹ رہے تھے۔

چیختے چیختے ساجد کی آنکھ کھل گئی...... اس نے ڈرتے ڈرتے دیکھا وہ قبر میں نہیں بلکہ اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ "اللہ مجھے معاف کر دینا۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور آنکھوں سے بہت سارے آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔ اگلے دن جب ٹی وی پر ناچ گانوں کا پروگرام آنے لگا تو ساجد نے کھٹ سے ٹی وی بند کر دیا اس کا دل کہہ رہا تھا۔ "ناچ اور گانا ہی تو زندگی نہیں ـــ زندگی اس راستے پر چلنے کا نام ہے جس پر چلتے ہوئے کبھی دل نہ کھٹکے!!

سکندر اعظم جب دُنیا فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا تو اس کا گزر ایک جنگل سے ہوا۔ ایک فقیر کو بے فکر سوتے ہوئے دیکھا تو اسے لات ماری اور کہا "میں دُنیا فتح کر چکا ہو اور تم اِدھر سو رہے ہو۔" فقیر اُٹھ کر بولا "لاتیں مارنا گدھوں کا کام ہے کیا دُنیا میں انسان ختم ہو گئے تھے جو ایک گدھے کو فاتح بنا دیا گیا۔" مرسلہ: محمد سلیم امام، ابوظہبی

مجھے یہ شعر پسند ہے

قارئین کے منتخب اشعار

یہ دل بہت اُداس ہے جب سے خبر ہوئی
ملتے ہو تم خلوص سے ہر آدمی کے ساتھ
مرسلہ ...... انجم عروج، کراچی

منزل کی تمنا ہے تو درکار ہے جرأت
رستے سے ہٹا دیجئے جو سنگِ گراں ہو
مرسلہ ...... مولا بخش، شادمان ٹاؤن

زندگی ریشم و کمخواب نہیں ہے
تجھ کو جینا ہے تو پتھر کا جگر پیدا کر
مرسلہ ...... محمد شبیر، کراچی

گلوں تک رسائی تو آساں ہے لیکن
ہے دُشوار کانٹوں سے دامن کو بچانا
مرسلہ ...... سیّد محمد اسامہ، راولپنڈی

مغرور ہمیں کہتی ہے تو کہتی رہے دُنیا
ہم مڑ کے کسی شخص کو دیکھا نہیں کرتے
مرسلہ ...... نہال احمد نہال، کراچی

کتنے غریب گھر ہیں اجالے سے دور دور
جتنی بھی روشنی ہے ستاروں سے چھین لو
مرسلہ ...... صدف مظفر، راولپنڈی

سردی میں ہیں کتنے جسم لباس سے بیگانہ
جتنی بھی چادریں ہیں مزاروں سے چھین لوں
مرسلہ ...... محمد ندیم، حیدر آباد

وحشت میں بھی منتِ کش صحرا نہیں ہوتے
کچھ لوگ بکھر کر بھی تماشہ نہیں ہوتے
مرسلہ ...... ہُما صابر، کراچی

رستے میں جتنے پیڑ ملے، سب کھوکھلے ملے
سوچا تھا تھک گیا ہوں ذرا پیٹھ ٹیک لوں
مرسلہ ...... محمد اظہر خان، کراچی

میرے بچپن کے دن

احمر ندیم، کراچی

دل ایسے بہلاتے تھے
جھولا روز جُھلاتے تھے
رات کو مجھ سے ملنے کو
چاند سے نیچے آتے تھے
کیسے بھولوں ان کا پیار
ہنستے اور ہنساتے تھے
جب بھی آنسو آ جاتے تھے
باغ میں پھر سے جاتے تھے
طوطوں سے اور چڑیوں سے
دل میرا بہلاتے تھے
بھوک اگر لگ جاتی تھی
میٹھا دودھ پلاتے تھے
رُوٹھ اگر میں جاتا تھا
مجھ کو منانے آتے تھے
دن وہ بچپن کے احمر
کیسے بیتے جاتے تھے

مائیکل فیراڈے

برقیات کا موجد

فہد احمد شجراہ
کندھ کوٹ

مائیکل فیراڈے ۲۲ ستمبر ۱۷۹۱ء میں نیوٹنگٹن میں پیدا ہوا یہ ایک لوہار کا بیٹا تھا۔

فیراڈے کو بہت ہی چھوٹی سی عمر میں جلد ساز کے پاس بطور شاگرد بٹھا دیا گیا۔ اسے بچپن ہی سے سائنس کا گہرا شوق تھا۔ وہ اپنے اسی شوق کی پیاس کو بجھانے کے لئے چھوٹی موٹی سائنسی کتب پڑھ لیا کرتا تھا۔

اس مشغلۂ زندگی میں پہلا قدم یہ تھا کہ مشہور سائنس دان سرہیمفری ڈیوی کے چار لیکچر سننے کا اتفاق ہوا، جن کے اس نے اشارے مرتب کئے جو اس نے سرہیمفری ڈیوی کو بھیجے۔ سرہیمفری ڈیوی کو وہ اشارے اس قدر پسند آئے کہ انہوں نے فیراڈے کو اپنے مددگار کی حیثیت سے نوکر رکھ لیا۔ فیراڈے نے شروع شروع میں کچھ تجربے کئے مثلاً دباؤ سے گیسوں کو سیال بنا دینا۔ ان تجربوں سے اسے خاصی شہرت حاصل ہو گئی۔

چنانچہ وہ ۱۸۲۸ء میں رائل انسٹی ٹیوشن کی لیبارٹری میں ڈائریکٹر مقرر ہو گیا۔ کچھ مدت بعد وہ رائل انسٹی ٹیوشن میں سرہیمفری ڈیوی کی جگہ کیمسٹری کا پروفیسر ہو گیا۔

کیمسٹری میں ان کی بعض دریافتیں یہ تھیں۔

فولاد کو دوسری دھاتوں سے ملانا، ایک مرکب جس سے اینلین رنگوں کی تیاری ممکن ہو گئی ایک ایسا کیمیاوی عمل جس سے عینک کا ایسا شیشہ بنایا جا سکے جس میں انعطاف نور کی طاقت بہت زیادہ ہو۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ "برق مقناطیسیت" سے متعلق تھا۔ اس نے ثابت کیا کہ ایک سرکٹ کی برقی رو کو ایک اور سرکٹ میں برقی رو دوڑا کر حرکت دینا ممکن ہے چنانچہ اس نے ایک مقناطیس کو برقی رو کے گرد مسلسل طور پر گھما کر آج کل کے برقی ڈائنمو اور موٹر کی بنیاد رکھی۔ یہ فیراڈے ہی کی مہیا کی ہوئی معلومات کا نتیجہ ہے کہ آج "علوم برق" کو سائنس دانوں نے موجودہ پیمانے پر پہنچایا۔ فیراڈے نے ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء کو ہیمپٹن کورٹ میں وفات پائی۔

پھول اور کلیاں

فریحہ ضمیر

سنیعہ جمیل

عامر قمر

عمر حیات   صائمہ   فرحان

عنبر، حلیمہ، ماریہ، زویا، اسیرہ، فارعہ

اسما، زینب، زبینہ، ہدیٰ، حذیقہ، عمارہ

جمشید خان، عمر حیات

عالم شہد، بخت نذیر

زرقا

بادیس

حلیمہ

مومن

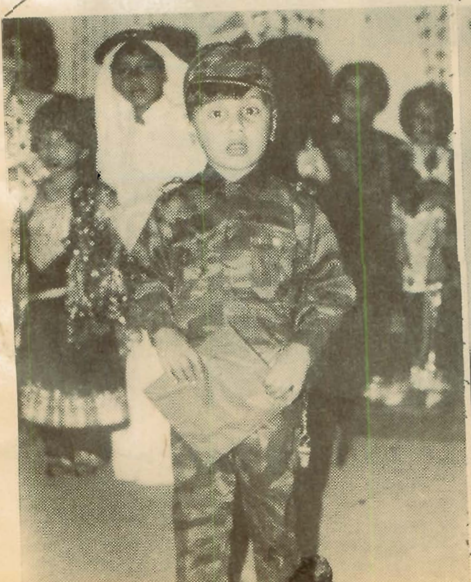

بہت کوشش سے

ستارہ سارہ علوی، کراچی

آپ نے معاشی پریشانی میں مبتلا شخص کی زبان سے عموماً یہ محاورہ سُنا ہو گا کہ آخر اس پیٹ کے دوزخ کو کیسے بھریں؟ لیکن اگر یہ پیٹ زیادہ ہی بھر جائے تو "توند" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی توند آپ کے جسم کو بد نما بنا دیتی ہے۔ اگر آپ کا مطالعہ و مشاہدہ وسیع ہو تو آپ نے ضرور نوٹ کیا ہو گا کہ مزدوروں، ریٹائرڈ فوجیوں وغیرہ کی توندیں نہیں ہوتیں۔ اس کی واحد وجہ کام ہے اور وہ بھی محنت کا کام۔ عموماً بیٹھ کر کام کرنے والوں یا سُست آدمیوں کی توند نکل آتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ توند کیا ہے؟ تو جناب اس کا سیدھا سا بلکہ موٹا سا جواب یہ ہے کہ توند فاضل چربی کا ذخیرہ ہے جسے آپ نہایت خلوص سے اپنے پیٹ میں یہ مصرع پڑھ کر جگہ دیتے ہیں کہ ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

یاد رکھئے "توند" آستین کا سانپ ہے۔ کیونکہ عمومی طور پر چربی، موٹاپا، اور توند دل کی بیماریوں کا باعث بنتی ہیں۔ توند کا علاج یہ نہیں کہ خوراک ختم کر دیں بلکہ کھائیے اور خوب کھائیے مگر وہ غذا جو طاقت سے بھرپور مگر چکنائی سے پاک ہو۔ مرغن غذاؤں سے پرہیز کیجئے۔ کام کی عادت ڈالئے۔ محنت کی لگن پیدا کیجئے۔ کیونکہ محنت ہی میں عظمت ہے۔ (توند میں نہیں)

توند بنانے والی چیزوں مثلاً مرغن غذائیں، کام چوری، زیادہ کھانے کی عادتوں وغیرہ سے پرہیز کیجئے کیونکہ یاد رکھئے توند اس کانٹے دار جانور کی طرح ہے جیسے بُلانا آسان ہے مگر بھگانا خاصا مشکل۔

اسے پلو سے باندھ لیجئے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

ذرا پہچانئے تو!

یہ تصویر ایک مشہور شخصیت کی ہے آپ کو اس شخصیت کا نہ صرف صحیح نام بتانا ہے بلکہ یہ بھی بتانا ہے کہ یہ شخصیت کس حوالے سے مشہور ہے۔ تین درست جواب بھیجنے والے ساتھیوں کو آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ مفت بھیجا جائے گا!!

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ____________________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ____________________

رقم ____________ بذریعہ ____________

پتہ ____________________

____

فون نمبر ____________

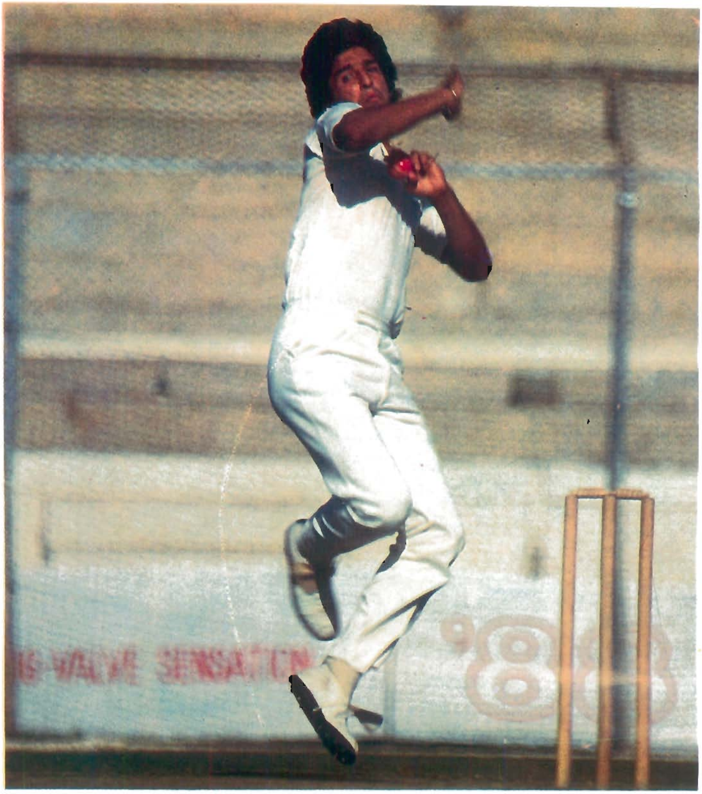

مہارت کی بلندی ۔ پی آئی اے کی جستجو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔ ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں جہاں وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہورہے ہوں۔

PIA

پاکستان انٹرنیشنل

باکمال لوگ ۔ لاجواب پرواز

جڑی بوٹیاں قدرت کا انعام، اِن سے حاصِل کردہ مرکّب کا نام
کوئس
اِنسٹنٹ
جوشاندہ
QUICE
QUICE
INSTANT
JOSHANDA
نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی سوزش اور خراش
سے فوری آرام کیلئے